ایک چھوٹی سی کتاب کی دیوانی

فہمیدہ ریاض

شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

ایک چھوٹی سی کتاب کی دیوانی؛ فہمیدہ ریاض

(تبصرہ/تجزیہ)

شاہ محمد مری

اشاعت:2014

قیمت: 200روپے

زیراہتمام: مہردر

انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن

پی او بکس 26، کوئٹہ، بلوچستان

ڈسٹری بیوٹرز:

سیلز اینڈ سروسز

کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کوئٹہ

فون:+92-81-2843229

فیکس:+92-81-2837672

اسٹاکسٹ:

یونیورسٹی بک پوائنٹ

شاپ نمبر10، کمپلیکس

بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

فون:0345 8813838

انتساب

ممتاز دانش ور اور مبارز، شبینہ رفعت کے نام
جس نے محض مزاحمتی شاعری ہی نہیں کی، بلکہ
عملاً اختیار و اتھارٹی کو چیلنج بھی کردیا

ترتیب

پیش لفظ	7
نا غمان دانش ور	11
تعلیم	17
واپس پاکستان	19
پتھر کی زبان	21
بدن دردیدہ	27
دھوپ	33
عہدِ ضیاالحق	39
ایڈیٹر	43
کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟	55
ہم رکاب	65
آدمی کی زندگی	69
نثر نگاری	79
کہانیاں	82

ناول 87

تراجم 90

سفرنامے 94

پبلشنگ، سیمینارز 97

فہمیدہ کا نظریہ 101

پیش لفظ

ذرا شمار کریں آج کے پاکستان میں کتنے لوگ ہوں گے، جنہیں ہم اپنے عوام کا 'کلچرل ترجمان' کہہ سکتے ہیں؟۔ ہاتھوں کی انگلیوں جتنے بھی نہ ہوں گے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اُن چند لوگوں میں سے ایک کا نام فہمیدہ ریاض ہوگا۔ جالبؔ و گل خانؔ کے بعد مزاحمت اور احتجاج کے ادب میں اُس سے بڑا نام اب کون سا ہے؟۔............جی ہاں، فہمیدہ ریاض۔

فہمیدہ بنیادی طور پر شاعر ہے مگر اس نے نثر میں بھی بے شمار کام کیا۔ وہ اپنی تحریروں میں کبھی غیر جانب دار نہ رہی۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ جانوروں کی طرح کھاپی کر اپنے عزیزوں کو اچھا مقام دلا کر مست و مطمئن رہتی ہو۔ وہ تو اِس مقام سے بہت بلند ہے۔ جب تخلیق، حقیر انفرادی اور تقریباً بیالوجیکل Paradigms سے وسعت پا کر آفاقیت کی طرف جاتی ہے تو اُسے کھڑا رہنے کے لیے زمین کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔ نظریہ ہی تو وہ زمین ہوتا ہے۔ وہ ساٹھ برسوں سے کمزوروں، ضعیفوں، بیماروں، مقروضوں، مقہوروں، مجبوروں کا ساتھ دینے کا بیڑہ اٹھائے ہوئی ہے۔ مزید برآں اپنی اکیڈمک زندگانی میں اس نے بے شمار سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

میری نسل کے لوگ شخصی ملاقات سے بہت پہلے اُسے جانتے تھے۔ برسوں قبل، اُس کی شاعری کے توسط سے۔ آپ نوجوان ہوں، انقلابی خیالات رکھتے ہوں............اور آپ کے ہاں مارشل لا لگ جائے ضیا الحق کا، تو آپ ہی بتائیے کہ آپ کا آئیڈیل کون ہوگا؟۔ وہی نا، جو اس اندھیر کے خلاف جدوجہد میں آپ کو نا امید نہ ہونے دے، تھاما پرچم سربلند رکھنے کا حوصلہ دے۔

آپ کے لیے گیت گائے، شعر گنگنائے، اور ترانے لکھے۔ وہی تو تھی فہمیدہ۔ وہ میری نسل کے لوگوں کی امید رہی۔ امید جو فلاسفر کے بقول ''زندگی کی محبوبہ ہے''۔

اور پھر روحوں، ضمیروں، دلوں، اور دماغوں کو آزمائش میں ڈالنے کا زمانہ آیا۔ محکوموں مظلوموں اور ضعیفوں کا دوست ملک سوویت یونین انقلاب کی عطا کردہ اپنی خوشحالی اور فربہی کے ہاتھوں پھٹ کر ختم ہو گیا۔ اس صدمے کو جھیلنے کی توفیق دلوانے والوں میں بھی یہی فہمیدہ ہی تھی، جس نے ''مجسمہ گرادیا'' نامی ترانہ لکھا تھا۔ اور اس میں وہ مصرعہ بھی شامل تھا جس کا مفہوم تھا کہ سوویت یونین کے زوال کے بعد ''زندگی دکان کے نام'' نہیں ہوئی۔ بلاشبہ فہمیدہ، حبیب جالبؔ کے بعد اردو میں سیاسی، سماجی اور نظریاتی میدان کی سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ اُس کا یہ فقرہ دیکھیں: ''جب غربت، ذہانت اور علم اکٹھا ہوں، تب تو ایک مارکسسٹ بنتا ہے''۔

جب میں کسی ایسی شخصیت کے بارے لکھتا ہوں جو اِس دور میں رہتے ہوئے بھی اِس دور کی نہیں ہوتی تو اپنے قلم کو خواہ جتنا بھی لگام دوں، یہ قابو میں نہیں رہتا۔ ایسے لوگ عام لوگ نہیں، غیر معمولی لوگ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وقت سے پہلے پیدا ہونے والے انسان اپنا سب کچھ داؤ پر لگائے رکھتے ہیں۔ توکلی لوگ، ایڈونچرر، بے پرواہ، بے لوث...... ہماری موجودہ بے ضمیری کی فضا میں ایک ''نیم ضمیر'' شخص بھی نعمت ہوتا ہے۔ اپنے اصولوں اور مؤقف پہ ڈٹ جانے والے فہمیدہ جیسے لوگ تو اعتبار کے دیوتا ہیں۔ آپ ہر خدشہ خطرہ کی آنکھیں بند کر کے اُن کی کمٹ منٹ پہ بھروسہ کر سکتے ہیں۔

اپنے وقت سے پہلے پیدا شدہ لوگوں کو اُس کی بھاری قیمت بھی دینا ہوتی ہے۔............
سب سے بڑھ کر دشنام والزام، رجکشن و آئسولیشن، بے سامانی بے وسائلی۔ اور پھر نہ ختم ہونے والی آزمائشیں۔ جاری آزمائشیں، تعداد و مقدار و سنگینی میں ہمہ لحمہ بڑھتی آزمائشیں۔

تاریخ کو پتہ ہے کہ جس کسی نے بھی انسان کی بھلائی کے لیے خود کو وقف کیا، وہ زندگی بھر عذاب جھیلتا رہا۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ انسانی اشرف قافلے میں ہمیشہ یاد رکھے جانے کا اہل بھی وہی بنا..........نسلوں تک، صدیوں تک۔ فہمیدہ بھی اُسی قافلے میں ہانپتی، گرتی، سنبھلتی، چلی آرہی ہے۔

وہ ساری زندگی روٹی اور 'پانی' کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ اور ناچتی نچواتی روٹی انسانی سماجی زندگی کے سفر کو لرزش و لغزش سے آلودہ تو کرتی ہے، کچھ فضول و حقیر سمجھوتے تو کرواتی ہے، فہمیدہ نے بھی کیے ہوں گے، کیے ہیں، مگر اسے تقدیر نے بڑی ''جی حضوری'' سے ابھی تک بچائے رکھا۔ کوئی ایسی بڑی سودے بازی اس نے اب تک نہ کی جس سے اس کے ''نیکیوں'' والے پلڑے کی غیرت کی مونچھ نیچی ہوئی ہو۔ دعا ہے کہ ہماری اس دوست کی بچی کھچی زندگی بھی سماجی شرمندگی سے پاک رہے۔

گو کہ وہ ایک بار کرائے کے چوپان کی ''ہی ہی'' سے ڈر گئی تھی، اور بے خداؤں کے بند و زندان سے فرار ہو کر ہندوستان جلاوطن ہو گئی تھی۔ مگر بلوچی والے ''کم سیالی سے گم سیالی اچھی'' کے مصداق ملک میں رہ کر بہت بڑی اور بہت زیادہ کمپرومائزوں سے بچ گئی۔

میں بتا چکا ہوں کہ فہمیدہ جیسے وقت سے پہلے پیدا ہونے والے سونا انسانوں کے بارے میں لکھتے ہوئے میرا محققانہ رویہ بار بار متزلزل ہو جاتا ہے۔......اور مجھے وہ لوگ بہت پیارے لگتے ہیں جو میرے غیر جانبدار محققانہ رویہ کو متزلزل کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ آج بھی جب میں فہمیدہ کے کسی خاص اقدام یا رویے سے شاکی ہو جاتا ہوں، یا احباب کی بحثوں کے دوران اُن کی کسی بھی رائے سے اُس کے بارے میں جب بھی متذبذب ہونے لگتا ہوں تو اُس کی شاعری پڑھتا ہوں۔ اُس کی شخصیت کی عظمت دوبارہ بحال ہو جاتی ہے۔

وہ ایک کثیر جہتی اور بہت ہی تخلیقی آرٹسٹ ہے۔ الفاظ کی ایک ایسی حسین ترتیب کی ماہر آرٹسٹ جو جمالیات و خیالات کے ستاروں کو اکٹھے ٹانکتی ہے۔ ایک پالتو، محکوم و بے سمت درمیانے طبقے کی فہمیدہ اکیسویں صدی کی عورت کی آواز بن کر ابھرتی ہے، اپنے خطے کے مظلوم و محکوم انسانوں کی آواز بن کر ابھرتی ہے............

اُس کا تذکرہ کیے بنا میں تو نہیں رہ سکتا!!۔

شاہ محمد مری

ماوند

29 جنوری 2014

ناغمان دانش ور

بلوچی میں اچانک برپا ہونے والی قضا کو 'ناغمان' کہتے ہیں۔فہمیدہ ریاض نامی خاتون ہماری 'ناغمان دانش ور' ہے۔وہ بڑی سے بڑی اور غیر متعلق ترین لوگوں کی کانفرنس وسیمینار و مجمع میں اچانک وہ مؤقف بتا دے گی جو ہم عامی لوگ اپنے بند حلقے میں بھی نہیں کہہ سکتے۔اللہ جانتا ہے کہ جھوٹ، ہم بھی نہیں بولتے۔مگر طالبان زدہ، اور بلوچستان میں مسخ شدہ لاشوں کی تلخ فضا میں کم ازکم الفاظ کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ موقف بھی جائے اور حاضرین کو ذرا سا ہضم بھی ہو جائے۔ مگر فہمیدہ ایسا نہیں کرتی، وہ ایسا کرنہیں سکتی۔وہ ڈنکے کی چوٹ پر سچ بولتی ہے اور ہم، بغیر کسی پیشگی خبر اور انتظام کے اس اچانک کی گرج چمک کے دفاع پر خود کو موجود پاتے ہیں، ایڈرینیلن کے زیراثر دل کی دھڑکنیں بڑھاتے ہوئے، الرٹ رہتے ہوئے...... ''ناغمان انقلابی، فہمیدہ ریاض''۔

وہ قلم کے مقدس اسلحہ کی مشاق ہوتے ہوئے بھی ایکٹوازم سے لادعویٰ نہیں رہتی۔ عورتوں کے حقوق کا معاملہ ہو یا بلوچوں کی نجات کا، شیعہ قتلِ عام کی مخالفت ہو یا طالبان کی دہشت و وحشت پر احتجاج، فہمیدہ آپ کو ڈرائنگ روم کے بجائے گلی میں نعرے لگاتی ملے گی۔جی ہاں حتماً

اور نعروں کے بارے میں تو وہ خود کہتی ہے: ''جن لوگوں نے کبھی احتجاج کا نعرہ نہ لگایا ہو، وہ کبھی یہ جان نہیں سکتے یہ کیسی جگر خراش صدا ہوتی ہے۔یہ نعرہ بلند کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے، محسوس کرنے اور صدائے احتجاج کے لب تک آنے کے دوران آدمی پر کیا گزرتی ہے''۔

فہمیدہ کبھی کبھی تو ایسی جگہ پہ اور ایسے موضوع پہ ایکٹوزم یا بحث چھیڑ دیتی ہے کہ اگر میری لمبی داڑھی ہوتی تو میں غصے سے اپنی داڑھی کب کا نوچ چکا ہوتا۔وہ ایسے خالی اور مہمل موضوع و مکان میں جدوجہد شروع کرتی ہے کہ جہاں شعلہ تو کیا راکھ بھی موجود نہیں ہوتی۔ہم اُس سے اپنا احتجاج ریکارڈ کر کے اُس وقت تک چپ رہتے ہیں جب تک کہ خود اسے احساس نہیں ہو جاتا۔بس پھر وہ ایک آدھ فون کر ڈالتی ہے یا فیس بک پہ ایک آدھ 'کانفی ڈنس بلڈنگ' فقرہ لکھ دیتی ہے۔یہ اشارہ ہوتا ہے کہ ''مٹی ڈال، اَگے چل''۔

میں اُسے زندگی کی کسی چوکھاٹ، کسی شعبے میں رکھنے کے لیے بہت مصیبت میں پڑا ہوں۔حیران رہا کہ اس ''مٹی کی مورت'' کو برفاب وسنگاب کا شاعر عطا شادؔ لکھوں، سیاست دان ولکھاری ومقرر وہیومن رائٹس ایکٹوسٹ کا مجموعہ حبیب جالبؔ لکھوں، جلاوطنی کے اسپیشلسٹوں کا ٹام پین کہوں، یا شاہ عنایت مکتب فکر سے وابستہ کسی مبارز سے مشابہت دے دوں۔فہمیدہ ان سب کی خصوصیات جو رکھتی ہے۔اسی لیے تو تقریب میں کمپیئر نے تعارف کراتے ہوئے کہا تھا.......... ''یہ ہیں فہمیدہ ریاض۔لیکھک، کوتری، فیمنسٹ اور ایک بدھی جیوی (دانش ور)''۔وہ کمپیئر سیاسی ورکر، جلاوطن، اور رائے کی مالک کہنا بھول گئی تھی۔

آپ حسن، گریس اور نسوانیت دیکھنا چاہیں تو فہمیدہ ریاض کو دیکھیے: اس کے متوازن ومتناسب وموافق وگندمی وحسین چہرے پر بِن کاجل اچھی لگتی بڑی زنگی ناوڑسی آنکھیں ہیں۔آپ حسین چال کے لیے عالمی زبانوں میں مستعمل سارے الفاظ ڈھونڈ دیکھیں تو اُس کا مجموعہ آپ کو خرام قدم، اور ایک ہلکے سے جھٹکے میں چلتی ہوئی فہمیدہ میں ملے گا۔آپ کو گفتار میں عورت پن سُننا ہو تو اُسی کو شعر پڑھتے ہوئے، اپنا افسانہ سناتے ہوئے سنیے، جیسے بول نہ رہی ہو غزل پڑھ رہی ہو...... بلا مبالغہ۔مگر وہ اپنی سکون آور، اور شانت کرنے والی آواز سے صرف غزل الغزال ہی نہیں

پڑھتی، انقلاب پڑھتی ہے۔ایسی میٹھی آواز سماج کے دھتکارے ہوؤں کی طرف داری میں بولتی ہے، عورت کے لیے، اقلیتوں کے لیے، مزدوروں کے لیے اور بے تعلیم رہ گئے بچوں کے لیے۔

اور اگر آپ کو عقل وخرد، دانش وشعور اور علمیت وتخلیقیت سے سرشار روح سے ملنا ہو تو کراچی کے طارق روڈ کے پاس کرائے کے مکان کے اوپری حصے کے گیٹ پہ سر جھکایئے، فہمیدہ وہیں ملے گی۔عورت وہیں ملے گی، عورت پن وہیں ملے گا۔اور یہ بات تو طے ہے کہ ہمارے عہد میں جن بڑے دانش وروں کے چراغِ شوق کو ہوائے تُند راس ہے تو اُن میں فہمیدہ سرفہرست ہوگی۔

اُس نے زندگی بھر کوشش کی کہ ہر بات کو زمین سے، مادہ سے، اور استدلال سے جوڑے رکھے۔اس نے اپنی کثیر الجہتی اصناف میں سے ہر ایک میں ثابت کیا کہ وہ اپنے سماج وعصر کی اولاد ہے۔نہ خود فرار اختیار کرتی ہے اور نہ اپنے قاری کو بھنگ پی کر سونے دیتی ہے۔اگر ٹی وی چینلوں کی بنائی ہوئی بڑی شخصیتوں سے آپ کی توجہ ذرا بھی ہٹ جائے، یا تمغوں ایوارڈوں کے سرکاری اعزازات پانے کے لیے مرجانے کی حد تک واری واری ہونے والے ''آدھے سر'' ادیبوں سے فراغت مل جائے تو سنیے، میں آپ سے بڑے دعوے سے کہتا ہوں کہ فہمیدہ اس وقت پاکستان میں ایک بہت بڑی دانش ور ہے۔(''سب سے بڑی دانش ور'' اس لیے نہیں لکھ رہا کہ مجھے دانش کا مقابلہ حسن رچانے سے گھن آتی ہے)۔

ہم بتا چکے ہیں کہ فہمیدہ جو سوچتی ہے بول دیتی ہے، جو سوچتی ہے لکھ دیتی ہے۔چونکہ ایک جینوئن دانش ور ہے اس لیے عام روسے ہٹ کر، مروج سے الگ ہو کر 'اُلٹی' باتیں لکھتی ہے۔فہمیدہ کو موقع ملے تو وہ، وہ باتیں ہمیں سیدھا کر کے بتاتی ہے جو ہمیں الٹی بنا کر بتائی گئی ہیں۔وہ ہمیں فرق بتلاتی ہے کہ ہمارے سماج میں اصل کیا ہے، نقل کیا ہے۔اصل، یہ ہے کہ یہاں جبر وظلم ولوٹ ومارو کذب وریا کا دور دورہ ہے اور ضمیر وایمان ووطن فروشی کی ساری سرحدیں پھلانگی جا چکی ہیں۔ماسٹر پیسے دے کر ہیڈ ماسٹر بنتے ہیں، بچے نقل کر کے پاس ہو جاتے ہیں۔کرپٹ، کرپٹوں کو رشوت دے کر نوکریاں لے جاتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں یونیورسٹیوں، کالجوں سے باہر تے کردہ جمِ غفیر روزگار نہ پا کر سارہ تک کج عمارت کو اونچا کرتے جاتے ہیں۔جنہیں روزگار ملتا ہے، وہ صبح سے شام

تک جائز ناجائز پر محنت کر کے اس قدر بھی نہیں کماتے کہ زندگی کی اشد ضروریات پوری کر سکیں۔ بوڑھے زندگی، زندگانی اور زندگانی کی نعمتوں سے ریٹائر ہو کر عبادت گاہوں کے ہول ٹائمر بن جاتے ہیں۔غربت، معاشی بحران میں ڈھل چکی ہے۔سماج تقسیم در تقسیم ہو کر ایک ایسے نکتے تک پہنچ چکا ہے، جہاں تقسیم اب چپقلش بن چکی ہے، بلکہ وہاں سے بڑھ کر رنجش اور وہاں سے کھلی جنگ میں ڈھل چکی ہے۔ مذہبی جنگیں، ایک مذہب کے بیچ فرقوں کی جنگیں، زبان کی جنگیں، نسل کی جنگیں.......... الغرض سوائے طبقاتی جنگ کے ہر طرح کی جنگیں ہو رہی ہیں۔(اُسی کو انگریزی میں انارکزم کہتے ہیں)۔

اور اِس سب کے خلاف بولنا، لکھنا گویا گناہِ کبیرہ بنا دیا گیا ہے۔ہم سارے لکھنے والے اسی گناہ سے تھر تھر کانپنے کے خوف میں ڈال دیے گئے ہیں۔صرف فہمیدہ اور اُس کی پارٹی ہے جو لکھتی ہے، لکھتی جاتی ہے، نتائج سے بے پرواہ ہو کر۔نثر میں، شاعری میں، فیس بک پہ، ایس ایم پس پہ۔فہمیدہ ایک مستقل اور لگاتار لکھاری ہے، ''ہول ٹائم'' لکھاری!۔فہمیدہ سچ کو کبھی سورج میں تلاش کرتی ہے، کبھی تاروں اور چاند میں۔یہ شریف روح کبھی ایم کیو ایم کے نوجوانوں سے خطاب پہ بے تاب ہوتی ہے، کبھی پیپلز پارٹی کے ہاں اپنا سارا علم رہن رکھنا چاہتی ہے.......... بلوچستان تو ویسے ہی اس کی امیدوں، تمناؤں اور خواہشوں کا مرکز ہے۔وہ تو محفلوں کے لیے بھی مِس فٹ ہے۔نہ صرف اپنی بے چینی میں، بلکہ گفتگو میں بھی کہ اُسے احمقانہ بات لاجواب نہیں، 'ترکی بہ ترکی' بنا دیتی ہے۔کوئی کہے کہ 'منٹو پاکستان میں آ کر تخلیقی موت کا شکار ہو گیا تھا' تو ہم آپ تو یہ سوچ کر چپ ہو سکتے ہیں کہ یہ بات بڑا ادیب حسن منظر کہہ رہا ہے۔مگر فہمیدہ ایسی مصلحت کبھی نہیں کرتی۔فہمیدہ مصلحت نہیں کرتی.......... ذات میں بھی، اجتماع میں بھی، مجلس میں بھی اور سماج میں بھی۔سرکش فہمیدہ!

اسی لیے تو اوپری طبقہ اسے 'دماغ کا کھسکا ہوا' قرار دیتا ہے۔اور ہم بھی حسبِ توفیق اُسے اتنا ہی بددماغ قرار دیتے ہیں، جتنا کہ وہ ظالم چاہتے ہیں۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم کئی بار خود بھی اپنے احباب کی ایک خاص عادت کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ وہ عادت اچھی نہیں ہے۔بس

اُس کے آگے اُس کا جواز ڈال کر موصوف کو ناراض ہونے نہیں دیتے۔ دراصل ہم خود بھی اُسے اُسی طرح پیش کرنے دیتے ہیں جس طرح کہ مخالفین اسے پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک زمانے میں ہم سب دعا کیا کرتے تھے کہ اے خالق، اپنے بندوں پر ظلم تم ہم سے لاکھوں گنا زیادہ ناپسند کرتے ہو، اس لیے اے باری تعالیٰ سرپھروں کی تعداد میں اضافہ فرما۔ قیامت کی گھڑی دیکھیے کہ یہی سرپھرے اب ہمیں اچھے نہیں لگتے۔ اور ہم بھی اپنے طبقاتی دشمنوں کے پروپیگنڈے میں آ کر اس کی بے باکی کو کوسنے لگ جاتے ہیں۔ گندے تالاب میں لوٹس کا یہ پھول کئی بار اس پر خود بھی خود کو برا بھلا کہہ دیتی ہے۔ مگر پھر کچھ سوچ کر بولتی ہے: ''کیا کروں......ایسی ہی ہوں...........''(1)

تنہا کردہ اور مس فٹ فہمیدہ سارا دن تو شاعری نہیں کرسکتی۔ کیا کرے؟۔ ملنے جلنے والے ویسے بھی کم ہوتے جا رہے ہیں کہ عزرائیل سے ملاقات انہیں فہمیدہ سے ملنے سے زیادہ محبوب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ڈاکٹر خدائے داد مرحوم کی طرح ہلا گلا پسند کرتی ہے۔ کوئی ادبی سیمینار ہو، ادبی سفر بالخصوص غیر ملکی، اور ادبی بحثیں ہوں۔ وہ جیسے آدم زاد کے اکٹھ کی کولمبس ہو۔ ڈھونڈھتی رہتی ہیں اس کی آنکھیں، سونگھتی رہتی ہے اس کی ناک کہ کہاں لوگ ہیں؟۔ پہنچ جاتی ہے۔ بات کرتی ہے، اپنا موقف سناتی ہے۔ اور مخالفین کی تعداد بڑھا کر سکون کے دو چار کش لگا کر گھر لوٹ جاتی ہے۔

مجھے اندازہ نہیں کہ وہ پہلے کیسی تھی۔ مگر اب وہ ایک 'بے چین روح' ہے۔ کوئی چیز ذہن میں سما جائے تو اس وقت تک بے چین رہے گی جب تک اسے کر نہیں لیتی۔ میں نے دیکھا کہ فہمیدہ سفر کرنے پہ خوش، بلکہ بہت پُر جوش ہوتی ہے، بدحواسی کی حد تک۔ بدحواس کیا وہ تو ہراساں ہو جاتی ہے۔ حیدر آباد تک بھی جانا ہو تو گھر کی الماریوں، سوٹ کیسوں، بیگوں میں سونامی برپا کرتی ہے۔........... اور اس کے بعد بھی میزبان کے لیے تیار کردہ تحفہ بھول جائے گی، مشاعرہ میں سنانے والا کاغذ گم کر دے گی، یا اپنی عینک کمرے میں ہی چھوڑ جائے گی۔

حوالہ جات

1- ریاض، فہمیدہ۔ شیشۂ دل۔ کتابی سلسلہ، آج 39، کراچی۔ صفحہ 93

تعلیم

فہمیدہ محض چار سال کی تھی کہ اس کا والد فوت ہو گیا۔ ماں نے خاندان کو پڑھایا، پالا۔ فہمیدہ ریاض کی والدہ کا نام خورشید بیگم (خاندانی نام حُسنہ بیگم) تھا، جو بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں اور فارسی زبان پر دسترس رکھتی تھیں۔ فہمیدہ ریاض کی دو بہنیں ہیں۔ اُس کی والدہ نے ایک بچے کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا، جن کا نام محمود الدین ہے۔ سکول کے دنوں میں فہمیدہ ریاض کا رُجحان پڑھنے لکھنے کی طرف بہت زیادہ تھا۔(1)

میٹرک کے امتحان میں فہمیدہ ریاض پورے صوبے میں فرسٹ آئی تھی۔ اُس زمانے میں وہ ادب اور مارکس اِزم کا مطالعہ بھی کرنے لگی تھی۔ مارکس ازم کی طرف اُس کی رغبت کا ذریعہ کوئی تحریک یا سیاسی جماعت نہیں بلکہ ترقی پسند ادب تھا۔

پھر وہ کالج گئی، جہاں پڑھائی بھی ہوتی رہی اور ساتھ میں وہ ریڈیو پاکستان میں نیوز کاسٹری بھی کرنے لگی۔ یہیں اس کی شاعری کا پہلا مجموعہ مرتب ہوا۔ بعدازاں وہ سندھ یونیورسٹی چلی گئی۔ وہاں ایم اے کے دوران وہ سٹوڈنٹس سیاست میں حصہ لینے لگی۔ اس نے ایوب رجیم کے یونیورسٹی آرڈی ننس اور طلبہ سیاست پر پابندی کے خلاف لکھا۔ اس نے 1966 میں پولیٹیکل سائنس اور اکنامکس میں گریجویشن کیا۔

فہمیدہ نے فروری 1967 میں والدین کے پسند کردہ لڑکے سے شادی کرلی۔ لڑکا لندن کا ایک آرکیٹیکچرل ڈیزائنر تھا۔ شادی کے بعد وہ لندن چلی گئی۔ وہاں ریڈیو بی بی سی میں کام کیا۔ 1972 میں اس نے لندن سکول آف فلم ٹکنیک سے فلم سازی کی ڈگری لی۔

1967 میں، برطانیہ میں قیام کے دوران، فہمیدہ ریاض 'سوشلسٹ پارٹی آف گریٹ برٹن' میں شامل ہوگئی تھی۔ اُس کا کہنا ہے کہ وہ مارکسی نقطہ نظر سے وابستہ ہے اور اِس کی بہت قدر کرتی ہے، اِس لیے کہ اِس نظام نے انسانیت کو ایک بہت بڑا تحفہ دیا۔(2)

اُس کے ہاں ایک بیٹی سارہ ہوئی۔

حوالہ جات

1- چغتائی، توقیر۔ روشن خیال لوگ۔ سانجھ پبلی کیشن، لاہور۔ 2011۔ صفحہ 44
2- چغتائی، توقیر۔ روشن خیال لوگ۔ سانجھ پبلی کیشن، لاہور۔ 2011۔ صفحہ 48

واپس پاکستان

کچھ برس کے بعد 1972 میں واپس پاکستان آئی۔ اُس کی طلاق ہوگئی تھی۔

پاکستان واپسی پہ 1973 سے 1976 تک لنٹاس پاکستان کے فلم، آڈیو اور کاپی رائٹس کے شعبے کی کری ایٹو ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کرتی رہی۔(1)

حوالہ جات

1- چغتائی، توقیر۔ روشن خیال لوگ۔ سانجھ پبلی کیشن، لاہور۔ 2011۔ صفحہ 43

پتھر کی زبان

میں نے حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ میں آٹھویں، نویں جماعت میں ہوں گا جب 'پتھر کی زبان' (1966 میں) شائع ہوئی تھی۔ اور وہ خود کس قدر کم سن تھی۔ جی ہاں فہمیدہ ریاض نوخیز عمر میں صاحبِ دیوان ہوگئی۔ میوز، مہربان تو اُس پہ شروع سے رہا!

فہمیدہ نے مروج صنف 'غزل' کو ٹھوکر مار کر پرے کر دیا اور نظم سے ابتدا کر دی۔ واضح رہے کہ اُس وقت شعرا، خصوصاً خواتین ابھی تک غزل ہی میں شاعری کر رہی تھیں۔ اُس کی ہم عصر اردو شاعر خواتین میں ادا جعفری، شبنم شکیل، پروین شاکر اور زہرا نگاہ تھیں۔

اُس کی نوعمر محبت کسی بے خواہش پتھر والی نہیں ہے اور نہ ہی درویش و راہبہ کی طرح چھپا دینے والی۔ وہ رومان کرتی ہے۔ حسیاتی تجربہ سے مالا مال رومان۔ وہ بغیر قدغن، اور احساسِ جرم کے اپنی سرشار محبت پہ عمل کرتی ہے اور ہر مرحلہ کو من و عن بیان کرتی ہے۔ وہ جبلی حقائق کو انسانی اور جمالیاتی دیدہ زیب پوشاک دے کر سامنے لاتی ہے۔

فہمیدہ محبت میں کامیاب بھی ہوتی ہے، ناکام بھی۔ مگر یہاں پھر وہ فیوڈل آہ، کوک،

فریاد، سوگ، روگ، خودسوزی، خودکشی نہیں کرتی۔ وہ اسے عام فطری اور معمول کے صدمے کے بطور لے کر آگے چل پڑتی ہے۔

فہمیدہ کا شعور اُسے بتاتا ہے کہ وہ پندرھویں، سولھویں صدی کی دیہی فیوڈل رسوم سے وابستہ بے توقیر عورت نہیں ہے۔ بلکہ وہ بیسویں صدی کے ترقی یافتہ صنعتی شہر کی انسان ہے۔ اسی لیے تو وہ غیر محسوس طور پر فیوڈل ویلیو سسٹم کا دُم چھلا عورت بننے کی بجائے نئی پیڑھی میں اُس کی قیادت کرتی ہے۔ وہ حیوان ذہن انسانوں کو اشرف المخلوقات دکھاتی ہے، وہ ذہین و باشعور ہستی دکھاتی ہے جسے عورت کہتے ہیں۔

اُس نے ایسے ایسے عنوان باندھے جن پہ آج بھی میدانی زرعی پاکستان کا دانش ور رام رام بولتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ ایک نوعمر لڑکی مسرت کے لمحات کی تمنائیں کرتی ہر حاصل لمحے کی توصیف و خیر مقدم کرتی ہے۔ فہمیدہ نے کبھی بھی 'اگر مگر' کو قریب آنے نہ دیا۔ اس نے کوئی ذومعنی اور مہمل بات نہ کی۔ اُس کی شاعری سیدھی بات کرتی ہے۔ (اور سیدھی بات کا مطلب بے حجاب بات کرنا بالکل نہیں ہوتا)۔ وہ اپنے انسان ہونے پہ اِتراتی ہے، اپنے عورت ہونے پہ تو باقاعدہ فخر کرتی ہے۔ وہ عورت کو زندگی، زندگی کا جوہر اور زندگی کا ارتقا گردانتی ہے۔ فہمیدہ اپنے قاری کو محض نظریاتی باتوں میں نہیں، بلکہ انسانی تجربات ہی سے گزار کر بات سمجھاتی ہے۔ وہ لگی لپٹی کو بحیرہِ بلوچ میں غرق کر کے کہہ اٹھتی ہے:

لوگ ٹھیک کہتے ہیں
دو بس ایسی چیزیں ہیں
جو کبھی نہیں چھپتیں
اُن میں ایک خوشبو ہے

دیکھیے، کس قدر خوبصورتی سے وہ محبت کی بات کرتی ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے لفظ کو بے حجاب نہیں ہونے دیتی، مگر اُسے برقع بھی نہیں پہناتی۔ عام نارمل انسان، انسانی مسائل، انسانی خواہشیں، انسانی محبت اور اُس کی سرشاری۔

فہمیدہ عورت کو پاک تخلیق گردانتی ہے۔ وہ عورت کے بدن کو مسکنِ گناہ قرار دینے والوں کو گیلے جوتے مارتی ہے۔ وہ انسانی تخلیق میں حسین ترین ہستی کو شیطان و شہوت کی سوچ سے پرکھنے والے اذہان کے لیے مزدک و موسیٰ بن جاتی ہے۔

میں نے اُس کی یہ کتاب کہیں جا کر 5-1974 میں کھول کر دیکھی ہوگی۔ اس میں موجود ذرا یہ شعر دیکھیے، جس پہ میں بہت دیر رکا تھا:

اصولِ زندگی ہے یہ، حیات ہے تو آس ہے
دبیز ہوں سیاہیاں تو پھوٹے صبح کی کرن

اس اولین کتاب میں موجود ساری شاعری عشقیہ شاعری ہے؛ بہت مترنم، متوازن، ابریشم جیسی نرم شاعری، کانچ جیسی نازک شاعری۔ محبوب کی عدم التفاتی، ہمیشہ کے لیے اس کا فراق۔ پیاسی روح کی شاعرہ۔ پیکروفا کی فہمیدہ۔

اور جو کہنے سے تھی زباں لاچار
کہہ گئی چور، گرمیِ رخسار

یا............

سنا ہے، پچھلے دنوں، دوستوں کی محفل میں
چلے تھے آپ کہ تردیدِ جرمِ عشق کریں
مگر جھجک سے گئے کچھ ہمارے نام کے بعد

آپ نے بہت سی لوریاں پڑھی سنی ہوں گی۔ مگر لوری ایسی بھی ہوسکتی ہے:

تم میں لوگ پائیں گے
ثبت کوکھ پر میری
اُس کے پیار کا بوسہ

فہمیدہ ابتدا ہی سے انسانی محسوسات کی خوبصورت نباض و ترجمان رہی ہے۔

منظر نگاری سے بھرپور............:

ذوق وِصل کی اب تو
خاک بھی نہیں باقی
رہ گئی تھی اک خواہش
میں نہ اس کو یاد آؤں
ایک تھی خلش دل میں
اس کو دکھ نہ ہو کوئی
اے عزیز اندیشے
آ گلے سے لپٹا لوں
اُس کے ساتھ تھا کوئی
مسکرا رہا تھا وہ

......اور یہ محض تخیل والے مصرعے نہیں ہیں۔ میں اُس سے تصدیق لیے بغیر دعویٰ کرتا ہوں کہ یہ سب اُس پہ بیتا تھا۔ میں آپ کو اپنے تبصرے سے پاک اُس کی طویل بحر والی نظم ''کچھ لوگ'' میں اُس کا مشاہدہ سناتا ہوں۔

وہ دنیا کی لمبی راہوں پہ چلتے جاتے کچھ ایسے لوگوں سے ملتی ہے جو اُسے ہمیشہ یاد آتے ہیں۔ حالانکہ وہ ''لوگ'' اُس کی محبت کے حصے میں نہیں آتے بلکہ راہ بدل کر مڑ کر ہاتھ ہلاتے ہیں، مگر وہ یادوں کی خوشبو بن کر فہمیدہ کے دل کو مہکاتے ہیں۔ اُسے زندگانی کے اسی سفر میں ایسا ہی ایک شخص ملا تھا۔ فہمیدہ اُسے دنیا کے اچھے لوگوں میں سے بھی اچھا قرار دیتی ہے۔ وہ دھیمے لہجے والا تھا، وہ دھیرے سے ہنستا تھا، اس کے بولوں میں لاگ نہ تھی، لگاوٹ نہ تھی۔ اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی تھیں، فقرے ٹوٹے ٹوٹے تھے۔ بس بیٹھے سوچا ہی کرتا تھا۔ اور وہ، وہ بات کرتا ہی نہ تھا جو فہمیدہ سننا چاہتی تھی۔ مگر ایسی نرم نگاہی کہ دھوکا ہو جائے۔ اُس کے ساتھ اُس کا ساتھ خوب رہا مگر وہ محسوس ہی نہ کرسکا۔ اور اگر کبھی شاعرہ کے دل کی بات بوجھ لیتا بھی تو بہت حیران ہو جاتا، اور اُس کی اس حیرانی

پر شاعرہ شرمندہ ہوکررہ جاتی۔

بات فہمیدہ کی شاعری کی ہورہی ہے، میں اِسے جاری رکھوں گا مگر میں اُس شخص کے بارے میں سوچ کر کھول رہا ہوں۔ میں اُسے مارڈالتا، اس لیے کہ میں کم ازکم بدھو پن میں کسی کو اپنا شریک وثانی نہیں مان سکتا۔

اب آپ اُس کی اس خوبصورت نظم کے آخری پانچ مصرعے پڑھ لیں۔ جس کا عنوان ہے،''کچھ لوگ''!

اب چہرہ اُس کا اُجلا ہو، یا آنکھیں اس کی ہوں گہری
یااس کے پیارے ہونٹوں کی ہر بات لگے ٹھہری ٹھہری
کچھ لوگ جواچھے ہوتے ہیں اور راہوں میں مل جاتے ہیں
ہیں اُن کو اپنے کام بہت، کب اپنا وقت گنواتے ہیں
کب پیاسے پیاسے رہتے ہیں، کب جی کو روگ لگاتے ہیں

اب میری طرح لمبی 'آہ' کہہ دیں ۔ چائے کا وقفہ کریں ۔ باقی بات وقفہ کے بعد پڑھیں۔ یہ وقفہ ضروری ہے، آپ کے ادبی ذوق ولطف کو گہرا اور وسیع اور جمیل ولطیف بنانے کے لیے۔ ہاں وہ آخری پانچ مصرعے دوبارہ پڑھ کر کتاب بند کردیں۔

****

فہمیدہ (اُس کی ہدایت کے مطابق لفظ Fahmida ہے، Fehmida نہیں) اُس ''نوعمری'' میں کچھ مصرعے کہہ گئی تھی۔ حالانکہ وہ اب آج اِس کی موجودہ عمر میں کہنے کے مصرعے تھے
:

مرے دل میں اک پھول امید کا تھا
اُسے وقت کے ہاتھ نے نوچ ڈالا
اب اُس زخم سے تجربہ رِس رہا ہے

کاش مجھے اپنا پڑھا ہوا ''پتھر کی زبان'' کا اولین نسخہ مل جائے تاکہ دیکھ سکوں کہ میں نے اُس پر کیا تبصرے لکھے تھے، یا کون سے صفحے کو کئی بار دُہرا دُہرا کر پڑھا تھا۔ شاید یہ مصرعے:

ہر ایک خضر پہ ، رہزن کا شک گزرتا ہے
ہر آستین میں خنجر دکھائی دیتا ہے

پرے سرکتا ہی جائے گا کیا سحر کا افق ؟

یا شاید یہ والا مصرع:

کبھی تو اے خدا، کبھی تو ہم بھی مسکرائیں گے!

****

1976 میں ''ادھورا آدمی'' کے عنوان سے اُس کی نثر کی ایک کتاب شائع ہوئی۔ 1979 میں سندھی شاعری سے تراجم کی کتاب'' حلقہ میری زنجیر کا'' شائع ہوئی۔ اسی طرح 1985 میں پاکستانی زبانوں کے حوالے سے اس کی کتاب Pakistan Literature and society کے نام سے آئی۔

بدن دریدہ

فہمیدہ مامتا پر شاعری لکھ رہی تھی؛ آرزوئے وصل، ازدواجی مباشرتی محبت اور ایسے دیگر موضوعات پر جو فیوڈل معاشرے میں عورت کے منہ سے اچھے نہیں لگتے تھے۔ ''پتھر کی زبان'' کے بعد اس کا اگلا مجموعہ کلام ''بدن دریدہ''، شائع ہوا جس پہ ایک غلیظ غلغلہ بلند ہوا تھا۔

بھئی یہ کتاب نہیں ہے، یہ جنگی ترانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ مقہوروں، مجبوروں اور محکوموں میں سے سب سے محکوم آبادی یعنی عورت کے جنگی ترانے۔ یہ صرف جذباتی انداز میں حوصلہ بڑھانے کے ترانے نہیں ہیں بلکہ یہ تو 'شعور کی راہنمائی' میں حوصلہ بڑھانے والے ترانے ہیں۔ ''بدن دریدہ''، حیرتوں، سوالوں کا ایک مجموعہ ہے جو افلاطون کے ڈائیلاگز کی طرح اپنے اندر ہی اپنے جواب رکھتا ہے۔ یہ مجموعہ کچھ بہت زیادہ باشعور اور میچور سیاسی وسماجی معاملات پہ نہیں ہے۔ یہ اُس کے اپنے اندر کا اظہار ہے۔ یہ ایک شہری کالج لڑکی کی شاعری نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسی عورت کی شاعری ہے جو اب شادی شدہ خاتون بن گئی ہے۔ جہاں sexuality کو زبردستی کے ذریعے سماجی ضرورتوں کا دستِ نگر بنا دیا گیا ہے۔ سماجی رسوم عورت کی خواہشات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتی

چلی جاتی ہیں۔ یہ مجموعہ ایک عورت شاعر کے دل ودماغ کے عظیم ابھاروں کا اظہار ہے۔ پھر وہ عورت جب ماں بن جاتی ہے تو وہ بہت بڑے جسمانی اور جذباتی تجربات سے گزرتی ہے، جنہیں وہ لفظ و شعر کا جامہ پہناتی ہے۔ ایسے تجربات، ایسے موضوعات جو سماج کے اندر منکرات وممنوعات میں تصور ہوتے تھے۔ اور جب یہ موضوعات ایک عورت کے منہ سے نکلے تو ایک قیامت آ گئی۔ یہاں عورت اپنے بارے میں بڑی بہادری سے بول رہی تھی، اپنے تجربات کے بارے میں بات کر رہی تھی، اپنے جسم کے بارے میں بتا رہی تھی، اور اپنے حمل ٹھہرنے کو 'جسم سے پھوٹنی روشنی' قرار دے رہی تھی۔ اُسی دن تو گویا اُسے ساری مقدس کتابوں، پیمبروں، بادلوں سے پرے فرشتوں، رنگ، سنگت، سُر، پھول، کلیوں، اشجار، صبح دم پیڑ کی جھومتی ڈالیوں، خیر کے دیوتا، حسن، نیکی، اور خدا سب پر اعتبار آ گیا تھا۔ وہ اپنے حمل کے مراحل بیان کر رہی تھی، اپنی زچگی کی مسرتیں، تکلیفیں اور ماں بننے کے احساسِ تفاخر کا اظہار کر رہی تھی اور دودھ پلانے کے دوران اپنی پُرمسرت روحانی وجسمانی سرگزشت لکھ رہی تھی۔ بدن، اپنے معانی اور مفاہیم بدل چکا تھا۔ وہ، وہ معانی ومفاہیم بدل چکا تھا جو اُسے دوسروں نے دے رکھے تھے۔ یعنی یہ کہ ''عورت کمزور ہے، نازک ہے، واہموں کی پروردہ ہے، مصلحت سے ہم بستر ہے، ضعف ویاس کی مادر ہے، جبر وخوف کی دختر ہے، موسموں کی شدت سے پگھل پگھل جاتی ہے''۔

اب، اِس کتاب میں عورت نے دوسروں سے اپنے بارے میں بیان دینے کا حق چھین لیا۔ اب عورت اپنے بارے میں خود بول رہی تھی۔ اب بدنِ زن خود بول رہا تھا۔ زنِ زندہ کا بدن، ایسے انسان کا بدن جہاں کمر لچکیلی نہیں بلکہ دس دس اینٹیں سر پہ اٹھانے والے بوجھ تلے مضبوط ہے۔ جہاں ہاتھ مہندی رچے اور شاہی قالینوں سے بھی نرم نہیں بلکہ اونٹ کے پیر کی طرح سخت اور پیاز و مرچ وہلدی کی بساند لیے ہیں۔ جہاں چہرہ للچاتی بے حیا آنکھوں کی بھوک کی تسکین نہیں کرتا، نہ ہی کمزور ایمانوں کے لیے خطرہ قرار دے کر اُسے اونچی دیواروں اور موٹے برقعوں، ڈبوں میں بند رکھا ہوا ہے، بلکہ یہ چہرہ اب محنت کی بے پردگی کے نور سے منور ہو کر رواں دواں زندگی میں آن موجود ہوا۔ عورت درانتی تھامے کھیت سنبھالتی ہے۔ چارہ، بھوسہ، اناج............اور پھر اس اناج کی پسائی،

گوندائی، پکائی تک کے ہر مرحلے پر وہی تو ہوتی ہے۔ مضبوط بیل کی طرح صحت مند، بار بردار گدھے کی طرح سخت جان، اونٹ کی طرح پیاس و بھوک و مشقت کے لیے برداشت بردار، اور اشرف المخلوقات والا دماغ و تخلیقی صلاحیت .... فہمیدہ نے ''صنفِ نازک'' کا لفظ اٹھا کر اس لفظ کے مالک دانش وروں کے منہ پر دے مارا۔ اس نے دنیا کو وہ دنیا دکھادی جہاں وجودِ زن، کائنات کے رنگ کے علاوہ روٹی روزی کا ضامن بھی قرار پایا۔ اس نے اپنے قارئین کو عورت کی لمبی رانوں سے اُوپر، پیچیدہ کوکھ سے بھی اوپر،' اور اُبھرے پستانوں سے بھی اوپر عورت کا سر دکھایا۔ سر کے اندر کا دماغ، دماغ کا شعور، اور شعور کی بلندی دکھادی۔ اس نے دکھادیا کہ عورت کے زیرِ پستان ایک پارہ دِل بھی ہے، کہ عورت کی لو ہا روح بھی ہے، اُس کا نطقِ گویا بھی ہے، اس کی انگلیوں میں صناعی بھی ہے، اس کے ولولوں میں بے باکی بھی ہے، وہ عشق آشنا، وصل شناسا، اور ایک مکمل انسان ہے۔

.... اور فہمیدہ نے خضداری تلوار کے وار جیسی یہ ساری باتیں نعرے بازی والے اسلوب میں نہیں لکھیں بلکہ یہ سب حقائق اُس نے شعریت اور اس سے وابستہ سارے جمالیاتی ادب آداب کے ساتھ لکھے.......... ہر لفظ گویا متعصبین کے گردے میں نوکیلا پتھر تھا۔

جی ہاں، اب عورت بول رہی تھی جو قرنوں سے گنگ دام تھی۔ ایسی عورت جو اگر چرواہی معیشت سے وابستہ تھی تو سوائے 'بھیڑ بکریوں کی زبان' کے کچھ بول نہیں سکتی تھی، اور اگر زرعی معیشت والی عورت تھی تو پھر وہ تو پردے کے پیچھے سے بھی آواز نہیں نکال سکتی تھی۔ صنعتی شہروں والی عورت کی زبان بھی ساکت تھی، اس کے دست و پا یا تو مشقت میں غلطاں تھے، یا پھر وہ دولت و شہرت کے کُہر میں ڈوبے شہروں کے بالا خانوں میں شہوت پرستوں کی پہنائی گھنگرو کی آواز میں اپنا نطق کھو بیٹھی تھی۔ علم، ادب، ثقافت اور سیاست کا پورا علاقہ اُس کے لیے ممنوعہ تھا۔

فہمیدہ آئی، لولاک لرزاں آواز ساتھ لے آئی۔ بلند الحان بات لائی، کوہِ شاشان جتنی وزن دار دلیل لائی، جگر بُر طنز و تنقید لائی۔ وہ آئی، دل و دماغ کے ساتھ۔ انسانی خد و خال کے ساتھ، احتجاج و اعتماد کے ساتھ۔ اُس نے مرد اور عورت کے رشتوں کو محض مخالف جنسوں کے بیچ حاکم و محکوم کے بطور نہیں دیکھا۔ بلکہ اس نے مرد و زن کے غلام اور آقا کے تصور کو میوزیم کے حوالے کر دیا۔ اس

نے مرد کو حاکم کے بطور ٹھکرا دیا، اور دوست و ہمدرد کے بطور قبول کیا۔ اس نے تو اپنے صنفِ مخالف دوست کے لبوں کے شعلۂ فروزاں کو اپنے سرد ہونٹوں پر سے برفیلے ذرّے چننے کا باعث قرار دیا۔ وہ اُس ہم سر و برابر دوست کے اجالے میں بھیگنے کو انسانیت قرار دیتی ہے۔ ہمہ وقت ایک دوسرے کی آزادی آبادی کے لیے برسرِ پیکار دو حلیفوں والا رشتہ۔

فہمیدہ ہمارے خطے کی کارل ساگاں ہے، جس نے تاریکی کے خلاف ہمہ جہتی لڑائی کی۔ ہمارے منطقے میں ظلمت کے خلاف 'جاگتے رہنا' کی صدا لگانے والوں اور والیوں میں فہمیدہ اول صف میں کھڑی ہے۔ اس نے روشنی کی دشمن تاریکی، سے کبھی کوئی رعایت نہ کی۔ تاریکی جو جرم بھی ہے اور جرم کی پاداش بھی۔ فہمیدہ نے تاریکی کو، ظلمت کو، اندھیرے کو، اندھیر نگری کو کبھی سکون سے رہنے نہ دیا، اُسے اُس کے حواریوں موالیوں سمیت جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''بدن دریدہ'' ہی کی یہ قصہ خواں ہمیں اُس عجب مملکت کے بارے میں بتا رہی تھی، جس کے حکمران مدت سے جانور تھے اور جس کی رعایا کو اس کا پتہ تک نہ تھا۔ اور اُسی نے اُس مملکت کے اپنے ہم وطنوں سے رقص کرتے رہنے کی فرمائش کی: غیظ کا رقص، بکھرے ہوئے پندار کا رقص، رنج و رسوائی، امیدِ نگوں کا رقص جس میں مصلحت اندیشی کا پیرہن صد چاک ہو جائے، جہاں اپنے اشکوں کی برستی ہوئی بوچھاڑ میں آیا جائے، جہاں جھجکتے بازو ہوا میں بالآخر لہرا ہی جائیں، جسم رقص کے گرداب میں چکرا چکرا جائے۔.......... اور یہ رقص جب ایک محلے، ایک گاؤں، ایک شہر کی حدود سے نکل کر حلقہ در حلقہ بھنور بنتا جائے، تب نہ صرف جسم و جاں رقص کرتے ہیں بلکہ نطق و زباں رقص کرنے لگتے ہیں۔ یہی رقصِ خلقت تو بھونچال ہوتا ہے، تخت و تاج کے لیے۔ تخت برائی ہوتی ہے، تاج شیطانیت ہوتا ہے۔

ہم ڈسپلن کے مارے لوگ تو ایسی کوئی بات پڑھ اور بول نہیں سکتے تھے، جس کے نتیجے میں ہمیں لاحول ولا قوۃ بولنا ہوتا۔ اس لیے جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی، وہی کچھ ہم نے اُس کی اِس کتاب میں پڑھا اور سمجھا۔ البتہ جن عِطر زدہ پوشاک والوں کے دل، گوبرِ گناہ سے اَٹے تھے، اُن کو اِس کتاب میں جنس اور عریانیت ہی نظر آئی۔ دنیا بھر میں عقل کے دشمن صرف ایک ہتھیار سے واقف

ہیں: ’’سنگسار، تیل کی کڑاہی میں سر، یہ سزا، وہ عقوبت‘‘۔ چنانچہ ملّا غرّا غرّا کر بولا ، پریس شہ سرخیاں چیخا، دانش ور قلم کی سیاہ کاریاں کرتا رہا............اور زنگ آلود آنکھیں اپنے ہم نواؤں کی آنکھ بچا بچا کر اُسے پڑھتی رہیں..........مگر عورت کے دل ود ماغ پہ ڈالے سیاہ دبیز کپڑے کو تو فہمیدہ نے نوچ ڈالا تھا۔ پہلا پتھر شیطان کو لگ چکا تھا۔ اب وہ خواہ اپنی مجلسِ شوریٰ بلاتا یا میکارتھی اور رنگ زیب اور ضیاالحق کی ارواح سے ’المدد المدد‘ پکارتا، فہمیدہ ہر انجام کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

ایک انصافی سماج کے قیام کی جدوجہد کرنے والوں کو پتہ ہے کہ حکمتِ عملی اور داؤ پیچ بہت سنجیدہ موضوع ہوتے ہیں۔ معروضی حالات کی مناسبت یا غیر موزونیت کی دُہائیاں ہم ہر وقت سنتے رہتے ہیں۔ مگر فہمیدہ نئی نسل کو اپنی نظم ’’مردمکِ چشمِ من‘‘ میں دلچسپ فرمائش و تاکید کرتی ہے:

اس جہاں میں ضرور، بالضرور
یاں کہ واں
یا نہاں
رنگ سنہرا بھی ہے
اور جو نہیں ہے تو اُس کو خلق کر

بھئی معروض برابر موزوں نہیں ہو تو کیا معروض کے مہربان ہونے کا انتظار کیا جائے؟۔
معروض کو یہاں وہاں تلاش کر، ضرور موجود ہوگا۔ اور اگر نہیں ہے تو: ’اُس کو خلق کر‘۔

اب بھی کوئی پوچھے کہ فہمیدہ کی دانش وری کا حاصل اور عروج کیا ہے تو میں شاید آج بھی یہ کہہ دوں: ’’بدن دریدہ‘‘۔

یہ بھی درست ہے کہ اس مجموعے پر ملّاؤں نے، جن میں صحافی اور بیوروکریٹ ملّا بھی شامل تھے، ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ نان سٹاپ یک طرفہ فتوے بازی سے فہمیدہ کتنے عرصے تک ذہنی دباؤ میں رہی ہوگی۔

پھر بھٹو کی بادشاہی ہوئی۔ کئی سوشلسٹ اپنا فلسفہ، نظریہ، کمٹ منٹ حتیٰ کہ وقار تک گندگی کے ڈھیر کے حوالے کر گئے، اور گندی مکھیاں بن کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ کئی اچھے مخلص کارکن اس

کے نعروں سے دھوکہ کھا کر اپنی صفوں سے بچھڑے اور بھیڑیاؤں کے غول میں جا ملے۔ مگر فہمیدہ تب بھی بھٹو کے خلاف تھی۔ اس کا یہ خیال ٹھیک نکلا کہ بھٹو، سوشلزم کو محض اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ مگر وہ یہ نہ سمجھ پائی کہ بھٹو ایک نہیں، سیکڑوں ہیں۔ اور سارے بھٹو صرف پیپلز پارٹی میں نہیں ہیں۔ اُسے اندازہ نہ ہوا کہ اور کتنوں نے سوشلزم کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا، استعمال کر رہے ہیں اور استعمال کریں گے!۔

......اور پھر اُسی زمانے میں نیپ اور پیپلز پارٹی باہم الجھ پڑے۔ اور بلوچستان میں جنگ شروع ہوگئی۔ فہمیدہ کیا کرتی؟۔ یہاں تیسری دنیا میں چوائس کبھی زیادہ میسر نہیں ہوتے۔ فہمیدہ فوج کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی، چنانچہ آٹومیٹک طور پر شرائط کے بغیر بلوچستان کے ساتھ ہوگئی۔ نیپ کی داخلی کمزوریوں اور کھوکھلے پن سے بے خبر سُچی سچی فہمیدہ بلوچوں کی طرف داری میں سارا ملک پھرتی رہی۔ وہ کوئٹہ آئی؛ جیل میں گل خان نصیر سے ملی۔ اور پھر اس نے ادیبوں کی ایک ملک گیر دستخطی مہم شروع کر دی۔ وہ اس سلسلے میں پنجاب بھی گئی، مگر اسے پذیرائی نہ ملی۔

دُھوپ

اِس مجموعے میں بھی اکثریت نظموں کی ہے۔فہمیدہ دراصل نظم کی شاعرہ ہے۔نظم مجھے ویسے ہی بہت پسند ہے۔اور جب مغزل ومغنی ورواں نظم فہمیدہ کے جادوئی دماغ سے تخلیق ہو رہی ہو، تو بات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔معنویت سے بھرپور، بلاغت سے سرفراز۔وہ شاعری سنانے سے قبل ہی انتباہ کرتی ہے کہ ''غزلیں وزلیں نہیں کہتی ہوں میں۔کچھ سچ مچ کی شاعری سننا چاہیں تو حاضر ہے''۔(1)

اُس کی ذاتی زندگی کے بارے میں جانیے کہ فہمیدہ نے ظفر علی اُجنڑ سے پسند کی شادی کی۔یہ شخص اُس وقت ایک سندھی کسان انقلابی جماعت کا کل وقتی کارکن تھا۔فہمیدہ کو بھی انقلاب کی بیماری لگی ہوئی تھی۔چنانچہ ہماری یہ......کلارازیٹکن، اپنے اوسپ......کی ہوگئی۔اس رومانٹس ازم کے ہاتھوں فہمیدہ نے ملٹی نیشنل دواساز کمپنی کی اپنی لگی لگائی نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔(صدقے جایا جائے اِس جذبے کے کہ جس کے تحت ہزاروں، لاکھوں لوگ اپنے روزگار تو کیا اپنی زندگی کی کشتیاں تک جلاتے رہے ہیں)۔

وہ اب وسطی کراچی کے تین کمروں والے ایک معمولی سے مکان میں رہتی تھی۔یہ مکان اب گھر نہ رہا بلکہ یہ سندھی کسان انقلابی جماعت کے کارکنوں کا ٹھکانہ بن چکا تھا۔یہ اُن کا گویا ہیڈ کوارٹر تھا۔میٹنگیں کرنا، پمفلٹ لکھنا اور مستقبل کے پروگرام بنانا......ایک ہمہ وقتی کام۔

فہمیدہ کی شاعری کا تیسرا مجموعہ ''دھوپ'' ہے جو اُس کی 1973 سے لے کر 1977 کی شاعری پر مشتمل ہے۔اب کے وہ نظریاتی طور پر مارکسزم سے نہ صرف مکمل آشنا ہوئی بلکہ اس نظریے کے ساتھ وابستہ بھی ہو چکی تھی۔اردو شاعرات میں شاید وہ اولین ہے، جس نے کہ ایک سیاسی سماجی نظام کے بطور مارکسزم کو قبول کیا۔یہاں ہمیں جگہ جگہ نظر آتا ہے کہ فہمیدہ استحصال زدہ انسانیت کی نجات کے لیے کارل مارکس کے نظریے کو کنجی قرار دے رہی ہے۔وہ یہاں اس خطے میں انقلاب لانا چاہتی ہے۔(جبر کے خلاف جو بھی انسان ہوگا، وہ گرتے پڑتے، بھٹکتے سنبھلتے بہر صورت مارکسزم جیسے فلسفے کی طرف ہی آئے گا)۔

اس مجموعے میں البتہ وہ زبان کے لحاظ سے ایک بڑا موڑ مڑتی نظر آتی ہے۔اس مجموعے میں اُس کی اردو میں ہندی کے الفاظ اتنے زیادہ اور اس قدر تکرار کے ساتھ گھس جاتے ہیں کہ پڑھنے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ہندی استعارات، اساطیر زیادہ شمار میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔اس سے نظم کی خوبصورتی تو دوچند ہو جاتی ہے مگر مجھ جیسے ہند، ہندو اور ہندوستان سے کم آشنا لوگوں کو تفہیم میں مشکل پیش آتی جاتی ہے۔میں تو اس معاملے میں کمزور ہوں ہی، دوسرے بھی بے شمار قارئین نے اس مجموعے کو بس سونگھ کر چھوڑ دیا تھا۔میں چونکہ فہمیدہ کی شاعری کے پکے مریدوں میں سے ہوں، اس لیے میں نے ہمت نہ ہاری اور اسے بار بار پڑھ کر اِس کے معانی کا دودھ، دوہ ہی ڈالا۔وگرنہ سچی بات یہ ہے کہ اُس کے اِس مجموعے نے میرے سر کے اوپر سے گزر جانے کی بہت کوششیں کیں۔

ہم دونوں کی مشترکہ دلچسپی میں آپ بھی شامل ہوئیے۔فہمیدہ کی مندرجہ ذیل نظم اسی مجموعے میں شامل ہے۔

کارل مارکس

نہ وہ کوئی اوتار پیمبر، نا جگ کا رکھوالا
اپنے جیسا اِک انساں تھا گھبری داڑھی والا

وہ بھی زندہ تھا دھرتی پر، ہوئی یہ بات پرانی
مرکھپ گیا، برس بیتے ہیں وہ بڈھا نصرانی
ہونی کا چکر باقی ہے ، انمٹ جنم کے ٹکڑے
اسی گھیر میں ناچ رہے ہیں بدل بدل کر مکھڑے
اپنے اپنے کام ہیں سب کو، اپنا اپنا جیون
اپنی اپنی سمجھ سے جگ میں سوچ رہے ہیں نردھن
دیکھتی آنکھیں دیکھ رہی ہیں، کیا ہے ہونے والا
پورب سے لے کر پچھّم تک دھڑک رہی ہے جوالا
پگڈنڈی کے کسی موڑ پر وہ بھی کھڑا ہوا ہے
سمے نے کتنی دھول اُڑائی ، شاید دیکھ رہاہے

دیکھا تھا سو بار یہ فوٹو، اس پل ٹھٹک گئی ہوں
ہونٹ کاٹ کر کانپ اُٹھی ہوں ،پل بھر جب سوچا ہے
تو کیسا انساں جنما تھا ...... کیا کچھ چھوڑ گیا ہے !
کالی دھرتی پھاڑ کے سورج جہاں جہاں نکلا ہے
آدمیوں نے تڑپ تڑپ کر تیرا نام لیا ہے
یوں تو سمے رُکے نہیں روکے، پر ایسا بھی ہوا ہے
اُڑتی صدی نے پل بھر ،تھم کر مڑ کے تجھے دیکھا ہے
اِک انسانی نسل نے تجھ کو رہ رہ کر سوچا ہے
ایک صدی نے ہاتھ اُٹھا کر تجھے سلام کیا ہے

فہمیدہ کی سوچ کا ارتقا ہمیں ہر نظم میں نظر آتا ہے۔ مارکسزم بہت سارے تضادات کو کھول کر اُس کے سامنے لاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں فہمیدہ اب اس طرف مزید اور مزید سیکھتی جا رہی

ہے۔فہمیدہ عورتوں کی نجات کا ترانہ گاتی ہے:

سنگ دل رواجوں کے
خستہ حال زنداں میں!
اک صدائے مستانہ!
ایک رقصِ رندانہ!
یہ عمارتِ کہنہ،ٹوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی چھوٹ بھی تو سکتی ہے

مگر ابھی تک وہ یہ جان نہ پائی تھی کہ ہر بغاوت خواہ جتنی بھی انفرادی کیوں نہ ہو، ہوتی سماجی ہی ہے۔ اکیلی فیمنزم بھی اُسی طرح گمراہی ہے جس طرح اکیلی ٹریڈ یونین ازم۔ ایک استحصالی نظام میں محض ایک محکوم طبقے کو الگ سے آزادی نہیں ملتی۔ یا تو سارے محکوم طبقات آزاد ہوں گے یا پھر سب کے سب اُسی طرح غلام رہیں گے۔ وہ اب تک نہ سمجھ پائی تھی کہ عورت کی نجات کی جدوجہد میں سماج کے دوسرے غیر مطمئن طبقات کو ساتھ لینا بہت ضروری ہوتا ہے۔

اِسی مجموعے میں ’’ایک کتاب‘‘ نامی نظم بھی شامل ہے۔ وہ اُس کتاب میں لینن کا ایک مضمون پڑھتی ہے، اور یہ نظم لکھتی ہے:

یہ کان لگا کر سنتی ہوں دروازے پر کیسی دستک!
اس گھر میں تو اندھیارا تھا
پھر کون جھروکہ کھلتا ہے
یہ کہاں سے آئی چندر کرن
جس سے روشن سارا آنگن

یہ تو اُس کی مستقل مزاجی ہے کہ فہمیدہ بلوچستان پر فوج کشی سے کبھی بھی متفق نہ ہوئی۔ اکیسویں صدی کی حالیہ پانچویں فوجی کاروائی میں بھی اُس کا جو موقف وہی ہے جو ستر کی دہائی کی فوج کشی میں تھا:

ہم وطن تو کوئی سننے والا نہیں
پتھروں نے سنیں
کرب کی سسکیاں
آخری ہچکیاں

یہ سیاہی رہے گی ابد تک
بے حسوں کی جبینوں کی کالک
اِس سیاہی کو پھر کون دھو پائے گا!

فہمیدہ نے شیخ مجیب کے قتل پر ''اکیلا کمرہ'' کے نام سے بہت خوبصورت نظم لکھی۔ اِس کا جو ٹکڑا مجھے اچھا لگا، وہ میں یہاں نقل کرتا ہوں:

سجدوں میں پڑے یہ غازی
گردن تو اٹھا کر دیکھیں
جس سمت جھکے ہیں ماتھے
اس سمت کہاں ہے کعبہ
اس اور نہیں کوئی قبلہ
منبر پہ نہیں ہے ملّا
یہ تو ایک ٹینک کھڑا ہے

اپنی نسل کے دوسرے انقلابیوں کی طرح فہمیدہ نے بھی فاشزم کا ساٹھ سالہ دور محض سنا اور دیکھا ہی نہیں، اُسے بھگتا بھی ہے۔ اس دور کی سب سے بدتمیز بات یہ تھی کہ موٹی گردن والے افسر، توندیں سہلاتے بیوپاری ایک طرح کی ہاہاکار میں مبتلا رہے کہ کہیں ننگے پاؤں بھوکے ہاری کوئی نئی بات، کوئی نیا نظریہ، کوئی نیا پیغام نہ سن لیں۔ ساری تگ و دو اِس خدشے سے نمٹنے میں رہی کہ اُن کے ذہن کے چالوکارخانے میں آکسیجن اور گلوکوز کا کوئی مالیکیول نہ جانے پائے۔ فہمیدہ

فاشزم کے سارے والی وارثوں، ڈھولچیوں اور پروپیگنڈہ بازوں سے صرف ایک بات کہتی ہے، واحد سچ کی ایک ہی بات کہ:

تم کرسی پر بیٹھے ہو
اور میں دھرتی پر کھڑی ہوں

فہمیدہ دنیاوی زندگی کے بارے میں بھی ہمارے اساطیری داناؤں کا تصور رکھتی ہے۔ اِن ناترس، مگر قابلِ ترس بیوروکریٹوں کی ساری زندگی گزر جاتی ہے اور آخر میں:

اب چپ چپ ہے حیراں کھڑا
اور بوڑھی آنکھوں سے تکتا
سانسوں کی ڈوری میں الجھا
سیڑھی کے سرے پر جھول رہا
جیون کی کمائی اِک بنگلہ
آنسوؤں کا حاصل...... اِک موٹر

حوالہ جات

1- ریاض، فہمیدہ۔ دھوپ اور پرچھائیاں۔ کتابی سلسلہ، دنیازاد کراچی، نمبر 33۔ صفحہ 83

عہدِ ضیاالحق......اندھیر آندھار

وزیراعظم بھٹو، قتل کے مقدمے میں گرفتار ہوا تو سندھیوں کو انقلاب شنقلاب سب بھول گیا۔جائز طور پر، سب اِس ٹھگ ترین اور جابر ترین 'مظلوم' وزیراعظم کے طرف دار بن گئے۔بوناپارٹزم کی نشان، پیپلز پارٹی عوام الناس کی ہمدردیوں کی ہر زکوٰۃ کی حقدار بنی۔دیگر پارٹیوں، ٹریڈ یونینوں کی طرح فہمیدہ اوراس کے خاوند والی انقلابی کسان پارٹی، پیپلز پارٹی کے دلدل کے پینڈے میں ڈوبتی چلی گئی۔

اب ایک بدترین عہد پاکستان پہ نازل ہو چکا تھا۔ملک میں میاں طفیل والا مارشل لا لگا۔نفرت کی وسیع اور، طویل عمر والی نرسری قائم ہوئی۔عورت ایمان کے لیے سب سے بڑا خطرہ، اور شیطان کا سب سے بڑا خلیفہ قرار پائی۔اسی سلسلے میں پردہ، سرکاری لباس قرار پایا۔مجمعے میں پردہ، جلسے میں پردہ، ٹی وی پر پردہ حتیٰ کہ گھر کے اندر واش روم کے اندر تک میں پردہ۔

کوئی راہ راستہ نہ تھا۔ ہرنعرہ تو استعمال ہو چکا تھا۔ کچھ بچا نہ تھا عوام کو متحرک کرنے کے لیے۔بندشوں، فرمانوں اور عوامی دکھوں کا بلوچستان والا ایک دشتِ بے دولت ہے جو ختم ہونے کو

نہیں آتا! ۔اس رجعتی سلطنت کا سارا شیش محل جس واحد لفظ سے پاش پاش ہوتا تھا، وہ لفظ تھا: جمہوریت۔ چنانچہ اس واحد لفظ کو دور رکھنے کے لیے سارے منتر اور ہر طرح کے انتظامات کیے گئے۔فہمیدہ نے تاریکی کی اِس قوت کو بھی بے باکی سے للکارا۔ایسی شاعری لکھی جو اندھیر اور اندھیرے کے خلاف لڑنے والوں کے لیے صحیفوں کا درجہ رکھتی ہے۔اُس کی شاعری مارشل لا کے خلاف اشاروں کنایوں کے بجائے براہِ راست ہوتی گئی۔'خانہ تلاشی'، 'کوتوال بیٹھا ہے'، 'کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے'............فہمیدہ آمریت سے بھڑ گئی۔

اُس نے یہاں کی سیاسی پارٹیوں میں شامل ہونے کی کوشش کی، مگر اُس کے مطابق وہ ایک آزاد ذہن رکھنے والے شخص کو اپنی پارٹی میں شامل کرنا ہی نہیں چاہتے۔اُس کے خیال میں ضیاالحق کے دور میں پیپلز پارٹی نے بہت جدوجہد کی اور پارٹی ایک ایسی صورت میں سامنے آئی جو اس مزاحمت کو آگے بڑھا رہی تھی۔ چنانچہ اُس نے پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر اس جدوجہد کے لیے کام تو کیا، مگر اُس کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک ایسی پارٹی ہے جو ادیبوں کو اپنا ممبر بنانا پسند نہیں کرتی۔(1)

اِس پورے عرصے میں فہمیدہ ریاض ہر طرح کے عوام دشمن اور غیر جمہوری اقدام کے خلاف لڑتی ہے۔وہ سنسر شپ کے خلاف کوڑھ مغز حکمرانوں کا صرف ایک بات میں حشر کر دیتی ہے: ''وہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ طلوعِ آفتاب کی خبر چھپائی نہیں جا سکتی''۔فہمیدہ ریاض مارشلائی پاکستان میں وطن کی سمت تک چھن جانے کی بات بہت خوبصورتی سے کرتی ہے۔

وہ اپنی شاعری اور تحریروں کے ذریعے ظلم وستم اور دباؤ اور پابندیوں کی فصلیں توڑتی رہی۔

ضیا کے کوڑے، پابندیاں، سختیاں، سنسر شپ ہماری نسل نے خود بھگتے ہیں، اس لیے تفصیل میں جائے بغیر بتا دوں کہ فہمیدہ پر سنگین مقدمہ درج کر لیا گیا۔

مارشل لا کے خلاف اُس کی نفرت کی بس ایک مثال ہی کافی ہے۔اس کا بیٹا کبیر اُسی سال پیدا ہوا تھا، جب ضیاالحق کا مارشل لا لگا تھا۔فہمیدہ نے اس کی پہلی سالگرہ پر اُس کے لیے یہ نظم لکھی تھی:

لال تجھے چھاتی پہ لٹا لوں، سن مرے من کی بات

جس دن تو چندا سا جنما، کالی تھی وہ رات
گھوم گئی تھی دیس کی دھرتی پر اندھی گھنگھور
لوگ نہتے سہم گئے تھے، دیکھ کے ننگا زور
جس دن تجھ کو مان بھری ممتا کا دودھ پلایا
خون چوستا وحشی اُس دن شہروں میں دَر آیا
جب ترا مکھڑا چوم کے میں نے لی تھیں تری بلائیں
کوڑے کھاتے بیٹے اُس دم دیکھ رہی تھیں مائیں
جب ترے ماتھے میں نے پہلا کاجل ٹیک لگایا
گھر گھر پر چھایا تھا اُس دن سنگینوں کا سایہ
ہار کے جنتا بیٹھی تھی جب تو نے سیس اٹھایا
بلک بلک خلقت روتی تھی جس دن تو مسکایا
گھڑی گھڑی نے پھڑک پھڑک کر تیرے دم کو پالا
کوکھ کا سکھ کیا سچ کا سکھ جب من میں بھڑکے جوالا
تو رن بھومی پر جایا ہے مرے جگر کے ٹکڑے
دیکھ تجھے پرچانے میں ماتا کا قدم نہ اکھڑے
کیسا لاڈا رے جیون کی ہر کٹھنائی جھیل
ہاتھ نہ میں روکوں گی ترا تو انگاروں سے کھیل
باٹ کے کانٹے تجھے پکاریں، لے یہ میرا ہاتھ
پہلا قدم اٹھا دھرتی پہ اپنی ماں کے ساتھ

حوالہ جات

1- چغتائی، توقیر۔ روشن خیال لوگ۔ سانجھ پبلی کیشن، لاہور۔ 2011۔ صفحہ 48

ایڈیٹر

ان سب شعبوں کے علاوہ فہمیدہ ایک رسالے کی ایڈیٹری بھی کرتی رہی ہے۔ یہ کام اُس نے 1977 سے شروع کیا۔ جو 1981 تک جاری رہ سکا۔ اُس کے اس سیاسی اور سماجی ماہنامہ میگزین کا نام تھا: ’آواز‘۔ یہ ایک روشن فکر رسالہ تھا جو عام آدمی کا شعور بڑھاتا تھا، اُسے عزت ووقار سے جینے اور دوسرے انسانوں کی بہبود و ترقی کے بارے میں سوچنے کی باتیں بتاتا تھا۔ بہت ہی جمہوری، روشن فکر اور سیاسی خیالات سے بھرا رسالہ۔ افغان انقلاب ہوا تھا، تو اس نے اپنے اداریے میں لکھا تھا: ’’وسط ایشیا کی سنگلاخ زمینوں پر سامراجی راکب منہ کے بل گر پڑے ہیں‘‘۔

اس رسالے کی مدیر اور ناشر ہونے کی سزا غداری ہوگئی۔ ضیاالحق جیسے دجال بادشاہ اور بھلا دے بھی کیا سکتے ہیں؟۔ رسالہ بند کر دیا گیا، فہمیدہ پر تقریباً چودہ مقدمے قائم ہوئے۔ اور ان میں سے ایک میں بغاوت کے الزامات شامل تھے، جس کی سزا پھانسی تھی۔

فہمیدہ کے بچے چھوٹے تھے۔ ظفر کو جیل بھیج دیا گیا۔ فہمیدہ بال بال بچ گئی۔ اسی دوران دلّی کے ایک مشاعرے کے لیے آیا ہوا دعوت نامہ، ٹکٹ اور ویزہ فہمیدہ کو سزائے موت سے بچا گئے

۔ ریاست کا کھوکھلا پن اس قدر زیادہ تھا کہ وہ اپنے دو بچوں اور بہن کے ساتھ مارچ 1981 میں ’مشاعرہ‘ پڑھنے ہندوستان گئی۔ اندرا گاندھی جب ایک وقت میں حزبِ اختلاف میں تھی، فہمیدہ سے مل چکی تھی۔ اب وہ وزیر اعظم تھی۔ اس نے اُسے وہاں رہنے میں مدد دی۔ فہمیدہ ’’سندھ نہ سہی تو ہند سہی‘‘ کے مصداق ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئی۔ خاوند بھی بعد میں رہا ہوا، اور ہندوستان فرار ہوا۔

یہ ہفت سالہ جلاوطنی تھی۔ (1) بقول اُس کے اپنے، ’’میری زندگی کے سات برس یہاں گویا بھٹک رہے ہیں‘‘ (2)۔ بے توقیر اور ہلکے میڈیا نے چیزوں کی حرمت اس حد تک ختم کر دی کہ ایک پورے خاندان کی جلاوطنی کے سات برس، کرکٹ کے سات رن جتنی اہمیت کے بھی نہ رہے۔ بہت معتبر اور گراں قدر الفاظ کو اس قدر بے ہودہ اور کثرت سے استعمال کیا گیا کہ وہ پاک الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ جمہوریت، سوشلزم، انقلاب، جلاوطنی، قید بامشقت، اسلام، کتنے بھاری الفاظ ہوا کرتے تھے۔ اس ملک میں ایک مشن و مہم کے بطور سارے دانش وروں کو الفاظ کے بھاری پن کے احیائے نو کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی۔ وگرنہ بے توقیری، سماج کی ہر قدر کے لیے دیمک بن جائے گی۔

مگر رک جاؤ، یہ دیکھو تو سہی کہ اُس نے لکھا کیا تھا جس کے جرم میں ستر و قبر جیسا وطن چھوڑ کر بقول مست ’’دِلی کے کالے کلوٹوں کی جھڑکیاں، دھکے کھانے پڑے‘‘۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ’مردِ مومن مردِ حق‘ ضیاالحق، امیر المومنین بن چکا تھا۔ اُس کے بدتمیز کوڑے ہر شہر کے ’ایوب سٹیڈیم‘ میں برپا ہوتے تھے۔ ’’کما حقہٗ، اللہ کے فضل و کرم سے، عورت کے سر پر دوپٹہ‘ اور ’چادر و چاردیواری‘ جیسے الفاظ ریڈیو ٹی وی اور ہر فرمان و اعلان میں شامل رہتے۔ اُس کی ایک سیاہ اصطلاح ’چادر اور چاردیواری‘ کے سارے شیطانی بخیے فہمیدہ نے اکھیڑ دیے تھے۔ اور اسی عنوان سے نظم لکھ کر اُس نے اپنے لیے پردیس میں جان بچانے کا اعزاز کمایا تھا۔

حضور میں اس سیاہ چادر کا کیا کروں گی
یہ آپ کیوں مجھ کو بخشتے ہیں، بصد عنایت!

نہ سوگ میں ہوں کہ اس کو اوڑھوں
غم و الم خلق کو دکھاؤں
نہ روگ ہوں میں کہ اس کی تاریکیوں میں خفت سے ڈوب جاؤں
نہ میں گنہ گار ہوں، نہ مجرم
کہ اس سیاہی کی مہر اپنی جبیں پہ ہر حال میں لگاؤں
اگر نہ گستاخ مجھ کو سمجھیں
گر میں جاں کی امان پاؤں
تو دست بستہ کروں گزارش
کہ بندہ پرور!
حضور کے حجرۂ معطر میں ایک لاشہ پڑا ہوا ہے
نہ جانے کب کا گلا سڑا ہے
یہ آپ سے رحم چاہتا ہے
حضور اتنا کرم تو کیجیے
سیاہ چادر مجھے نہ دیجیے
سیاہ چادر سے اپنے حجرہ کی بے کفن لاش ڈھانپ دیجیے
کہ اس سے پھوٹی ہے جو عفونت
وہ کوچے کوچے میں ہانپتی ہے
وہ سر پٹکتی ہے چوکھٹوں پر
برہنگی تن کی ڈھانپتی ہے
سنیں ذرا دل خراش چیخیں
بنا رہی ہیں عجب ہیولے
جو چادروں میں بھی ہیں برہنہ

یہ کون ہیں؟ جانتے تو ہوں گے
حضور پہچانتے تو ہوں گے!

یہ لونڈیاں ہیں!
کہ یرغمالی حلال شب بھر رہیں
دمِ صبح در بدر ہیں
یہ باندیاں ہیں!
حضور کے نطفۂ مبارک کے نصف ورثہ سے بے معتبر ہیں
یہ بیبیاں ہیں!
کہ زوجگی کا خراج دینے
قطار اندر قطار باری کی منتظر ہیں
یہ بچیاں ہیں!
کہ جن کے سر پر پھرا جو حضرت کا دستِ شفقت
تو کم سنی کے لہو سے ریش سپید رنگین ہو گئی ہے
حضور کے حجلۂ معطر میں زندگی خون رو گئی ہے
پڑا ہوا ہے جہاں یہ لاشہ
طویل صدیوں سے قتلِ انسانیت کا یہ خوں چکاں تماشہ
اب اس تماشہ کو ختم کیجیے
حضور اب اس کو ڈھانپ دیجیے

سیاہ چادر تو بن چکی ہے مری نہیں آپ کی ضرورت
کہ اس زمیں پر وجود میرا نہیں فقط اک نشانِ شہوت
حیات کی شاہراہ پہ جگمگا رہی ہے مری ذہانت

زمین کے رُخ پہ جو ہے پسینہ تو جھلملاتی ہے میری محنت

یہ چار دیواریاں، یہ چادر، گلی سڑی لاش کو مبارک
کھلی فضاؤں میں بادباں کھول کر بڑھے گا مرا سفینہ
میں آدمِ نو کی ہم سفر ہوں
کہ جس نے جیتی مری بھروسہ بھری رفاقت!

سات سال جلاوطنی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے، بس بیورغ کو پڑھیے، شہ مرید کو پڑھیے، فیض کو پڑھیے اور وطن پرست بن جائیے۔ ذلت بھری زندگی ہوتی ہے جلاوطنی۔ فہمیدہ کو وہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مہمان شاعر کے بطور مقرر کیا گیا۔ کشور ناہید، فہمیدہ کی اس جلاوطنی کی ایک جھلک یوں دکھاتی ہے:

''......میں دلّی گئی۔ یہ واقعہ ہے یوسف کے انتقال کے بعد کا۔ اگلے دن صبح فہمیدہ ریاض جو دلّی میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہی تھی، مجھ سے ملنے آئی اور گلے لگ کر یوسف کو یاد کر کے بہت روئی۔ یہ تو سچا واقعہ ہے۔ ہمارے سفارت خانے میں جو اعلیٰ افسر تھے، انہوں نے وزارتِ خارجہ کو فوری مطلع کیا کہ کشور ناہید پاکستان دشمن خاتون فہمیدہ ریاض سے مل رہی ہیں۔ واپس ملک میں آئی تو لمبا چوڑا Explanation سامنے تھا''۔(3)

اِس طویل اور تکلیف دِہ جلاوطنی سے 1987 میں فہمیدہ کی واپسی ہوئی۔ اِس دوران افغانستان میں ترہ کی صاحب کا انقلاب آ چکا تھا۔ اجاڑی گئی ارواح جاگ گئی تھیں۔ بادشاہت کو تباہ و برباد کرتی ہوئی نئی زندگی آئی تھی۔ اور اب ہم سب کی ساری توجہ افغان انقلاب کے دفاع پہ مبذول تھی۔

اس دوران فہمیدہ نے ایرک فرام کی کتاب Fear of Freedom کا ترجمہ کیا اور شیخ ایاز کی سندھی شاعری کا اردو میں ترجمہ کیا۔

فہمیدہ بے نظیر کی شادی پہ 1987 میں پاکستان لوٹ سکی۔ اس طرح کہ ہندوستان کے

بارے میں اُس کا جادو ٹوٹ چکا تھا۔ وہ لوگ بھی 'ہماری طرح' نکلے۔ ہندوراج، دھرم کی بالادستی، فتوے، نفرتیں، فرقہ واریت۔

یہاں (بے نظیر کی پہلی حکومت میں) وہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کی سربراہ بنا دی گئی۔ اُس نے اِس عہدے پر 1988 سے 1989 تک کام کیا۔

ایک اور جلاوطنی بھی ہماری شاعرہ کے لیے لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی تھی۔ نواز شریف کی پہلی حکومت میں فہمیدہ کو پارلیمنٹ کے اندر ہندوستانی ایجنٹ اور غدار قرار دیا گیا اور اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ بہ یک وقت تین ملازمتیں کرتی رہی کہ اپنے خاندان کو پال پوس سکے۔ یہاں اُسے کوئی روزگار دیتا نہ تھا۔ اب تو باہر جانے کی اجازت بھی ختم۔ تب اس نے چوہدری شجاعت حسین کو ایک کاغذ گھر بھیجا جس پہ اس نے لکھا: ''اپنے وطن کے شاعروں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرتا ہے؟''۔ اور دوسرے دن اس کا نام لسٹ سے باہر تھا۔

اِس بار وہ انگلینڈ چلی گئی۔ وہاں سے مشاعرے میں کچھ پیسے ملے، کینیڈا اور امریکہ بھی گئی۔ کہیں کسی یونیورسٹی میں تقریر پکڑ لی، کہیں کوئی مشاعرہ اچک لیا۔

ابھی وہ امریکہ میں تھی کہ بے نظیر کی دوسری حکومت قائم ہوگئی اور یوں فہمیدہ واپس پاکستان آئی۔ اس بار اُسے قائداعظم اکیڈمی میں جاب ملی۔ پھر بے نظیر کی چھٹی، پھر فہمیدہ کی چھٹی۔

ظفر کے ساتھ فہمیدہ کی اس نئی شادی سے اس کے دو بچے (بیٹی ویرتا علی اور بیٹا کبیر) پیدا ہوئے۔ ویرتا نے ڈاکٹری پڑھی اور کبیر امریکہ میں پڑھنے لگا۔ (کبیر کا ابھی 2007 میں امریکہ میں ایک حادثے میں انتقال ہوگیا، اور کُوکتی ممتا کو بقیہ زندگی بین کرنے کے اذیت ناک کام پہ لگا گیا)۔

زندگانی کے دیگر دکھ بھی بہر حال موجود تھے۔ خاوند کی طرف سے کوئی زیادہ خیال داری اور التفات حاصل نہ ہو سکا۔ ایک طرف بھرپور انقلابی امنگ تھی اور دوسری طرف ذاتی ناآسودگی (اب بھی فہمیدہ کا یہی حال ہے)۔ ایک اور نہ ختم ہونے والی خلش یہ رہی کہ پچھلے خاوند سے بیٹی سارہ نے اس کی نئی شادی کو ماں کی خود سے بے وفائی سمجھا:

''آپ نے تو مجھے چھوڑ دیا تھا نا۔ چھوڑ دیا تھا مجھے، ایک مرد کے لیے۔ شادی رچالی تھی۔ مجھے تو چھوڑ دیا تھا''۔(4)

فہمیدہ کا کلام پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ وہ ہر عہد میں عوام الناس کی دلیری اور اُن کی کامیابی کی گواہ بن کر ڈٹ جاتی رہی ہے۔ جب جب جمہور نے چاہا، اُن کی شاعرہ نے انہیں ''لبیک'' کہا اور اُن کے ساتھ چل پڑی، اُس طرف جہاں ''مستقبل قید ہے''۔......اور وہ اس راہ میں بغیر کسی خیانت کے عوام کو اُن کی امانت کی گٹھڑی واپس کرتی جاتی ہے......امید کی گٹھڑی۔

فہمیدہ سے میری پہلی ملاقات کراچی کے صدر کے علاقے میں کتابوں کی ایک بڑی دکان ،سٹینڈرڈ بک اسٹال میں ہوئی تھی۔ یہ دکان اب بند ہو چکی ہے کہ بکنے کو اور بہت کچھ آچکا ہے۔ بہ یک وقت میں، رسول بخش پلیجو اور فہمیدہ وہیں تھے۔ پلیجو صاحب سے سلام دعا میں فہمیدہ بھی شامل ہوئی۔ ایک آدھ لفظ خیر خیریت پوچھنے کا، اور اُس کے بعد میری اور پلیجو صاحب کی بحث۔ دو منٹ میں ہم دونوں، نظریاتی ساتھیوں کے بجائے رندولاشار بن چکے تھے۔ اُس کی تلوار میری ڈھال اور میری تیغ اُس کی تیغ بند (تعویز)۔ اب دیکھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری ربع صدی قبل کی ساری حیات بخش بحثیں بے کار چلی گئیں۔ انقلاب کا گھوڑا نہ پاؤں کے بل کھڑا ہو سکا اور نہ سر کے بل۔ ہمارا سماج ایسے تضادات میں قتل وقتال کرنے پر لگا دیا گیا ہے جو نہ بنیادی ہیں اور نہ قابلِ تصادم۔ تاریک راہیں، تاریک قتل اور تاریک قاتل۔ (لیکن کیا ہم اپنے اُن بحثوں اور سرگرمیوں پہ نادم ہیں؟ نو، نو ہمیں فخر ہے کہ ہم انسانوں کی طرح جیے، انسانوں میں کام کیا اور بے شمار انسان بنائے)۔...........
عجب اتفاق کہ اُس روز بحث میں ان جانی فہمیدہ میرے مؤقف کے ساتھ تھی۔ پلیجو صاحب نے چائے پلائی، کھٹی بحث میٹھی باتوں میں ڈھل گئی اور ہم دونوں پھر وہی کامریڈ بن گئے..........ایک دوسرے کی عزت کرنے والے، ایک دوسرے کا ساتھ دینے والے۔ میں نے پلیجو سے اس کے رسالے 'تحریک' سے اور اس کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھا، استاد نما دوست، رسول بخش پلیجو......

پتہ نہیں فہمیدہ پھر کہاں کھو گئی۔

اس کی گمشدگی کے دورانیے میں اُس سے ذاتی ملاقات کے مواقع کے بجائے، حرام قرار دی گئی باتوں (Taboo) کی اُس قلعہ شکن دانش ور پر اُچھالے گئے کیچڑ ہی سے سابقہ پڑتا رہا۔ خود گناہوں میں سات زمین تک دھنسے ہوئے ڈیوائن کامیڈی کے مکین، گنگا اشنان شدہ بن کر، فہمیدہ پہ زہرناگ والی آگ برسا رہے تھے۔ کوئی ہندوستانی ایجنٹ کا بوسیدہ اور سڑاند بھرا فتویٰ دے مار رہا تھا تو کوئی نظریاتی سرحدوں کا کوئی فرضی جغرافیہ تراش کر فہمیدہ کو اُس کا منکر گردان رہا تھا، اور کوئی اس پہ بے مہار آزاد خیال والی لایعنی اور لامعنی گالی مَل رہا تھا۔ ساری عمر مسکراتے مسکراتے اپنے چہروں کو سپاٹ بنانے والے افسروں، اور سرکاری دانش وروں کے بدبو بھرے دماغوں نے اُس وقت تک جتنے بھی الفاظ گھڑ لیے تھے، وہ سب کے سب فہمیدہ پر تھوپ دیے گئے: دوقومی نظریہ، جغرافیائی سرحدیں، نظریاتی سرحدیں، نظریہ پاکستان، ہنود و یہود، ایجنٹ، غدار، را، خاد، کے جی بی، حتیٰ کی آئی ایس آئی ایجنٹ، فلاں اسٹ اور فلاں ازم ....مگر ان ساری جاسوسی ایجنسیوں کی ایجنٹی کے باوجود فہمیدہ دو وقت کی روٹی کے لیے محنت کرتی رہی۔ پوری پاکستانی تاریخ میں فہمیدہ کمیونسٹوں، ولی خان اور بزنجو پر استعمال ہوتے رہنے والے اِن سارے القابات سے مزین رہی۔ سب کے برابر۔ مگر وہ عورت ہے ناں، اس لیے کچھ الزامات اضافی بھی تھے۔ بیالوجیکل الزامات۔ بیالوجیکل ہتھیار۔ حیا، شرم، مشرقی عورت، ''ایک خاتون غیر معمولی جنسی خواہشات کے ساتھ تیار.....''، عصمت، کافرانہ، متنازعہ، حجاب، غیرت، پردہ، اور دین کے متضاد الفاظ سب اس کے گلے کا ہار بنے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کسی محقق کو کبھی گالیاں اکٹھی کرنی ہوں تو بس فہمیدہ کے پاس چلا جائے۔ اُس مبارز خاتون نے سارے ''شہدادوں'' کے دیے ہوئے سارے پتھر اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ رکھے ہیں۔ ذرا سی گرہ کھول دے، سارے متقی سنگسار ہو جائیں۔

پاکستان میں اقتدار کی کرسی خواہ کسی کی بھی ہو، اس کی کوڑا بردار رکھوالی، پنڈت ہی کر رہا ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی ہوا کہ ہر کوڑا بردار کے کریہہ ہاتھوں کو شل کر دینے کے لیے ہمہ وقت ہزاروں پیٹھیں موجود رہی ہیں۔ اُن ہزاروں پیٹھوں میں ایک پیٹھ فہمیدہ کی بھی رہی ہے۔

بہادر انسان ہے فہمیدہ۔ کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔ جلاوطن کردہ، مالی تنگدستی مسلط کردہ، نظر

انداز کر دو اُس کی بلا سے۔ فہمیدہ نہیں بدلتی، مخالفین البتہ شکلیں بدل بدل کر، وضع قطع، لباس و چوغہ بدل بدل کر اپنے فرسودہ اور پتھر زمانے کے خیالات کے بچاؤ کا سوچتے رہتے ہیں۔ ہم گواہ ہیں کہ فہمیدہ ریاض کے تعاقب میں ہمہ وقت ہجومِ سنگ زناں رہا ہے، اس کی نازک روح کا نازک چہرہ زخموں کے نیل نشانوں سے اٹا رہا ہے، اُس کا کاسہِ سر خون سے تربہ تر رہا ہے، اس کے ''پیوندِ قبا دشنام بہت'' اور پیوستِ جگر الزام بہت۔ اعدا کی ساری دشنام طرازیاں بھی اُس کی، اور یاروں کی ساری بے التفاتیاں بھی اس کی۔ زندگی مشکل، چولہا مسئلہ، اور پھر زندگی کے پچھلے پہر نوجوان بیٹے کی موت کا صدمہ.........ایک کوہِ چلتن کا سا دل چاہیے پگھل کر معدوم ہو جانے سے بچنے کو۔ یہ عورت پہاڑ ہے کہ بکھرتی ہی نہیں۔ اب بھی ملے گی تو وہ اسامہ، ابامہ فکر پہ آپ سے گہرے اور بلند قہقہے لگوائے گی۔ اب بھی کان لگاؤ تو وہ کہتی ہوئی ملے گی: اے بے سروسامان، مفلس لوگو! تم کب تک خدا کی نعمتوں کو ترسو گے؟۔ اب بھی دیکھو تو فہمیدہ سربسجود دستانِ مبارک میں موجود ریشانِ مبارک کے لیے 'اموات' کی دعا کرتی ملے گی۔

مگر فہمیدہ تو طلسمِ اسمِ وفا کی قاری تھی، یہی قرات کرتی رہی۔ جگر برّاں قرات، کہ دانا کی روزی خونِ جگر ہے۔ درد بہ دوش یہ خانہ برباد سندھ بدر ہو کر ہند کی پناہ گزین رہی۔ جب بھی مؤرخ لکھے گا تو وہ کہ پاکستان کی مارشل لائی تاریخ میں انکار کے سفیروں کی ایک سرغنہ، فہمیدہ کا ذکر بھی کرے گا۔

فہمیدہ سے میری دوبارہ ملاقات اُس وقت ہوئی جب بلوچوں کی یہ دوست اپنی ہمہ وقتی فاقہ کشی سے تنگ آ کر بلوچستان پہ ایک بروشر نکالنے کے بہانے کچھ سرکاری، غیر سرکاری اشتہارات کی تلاش میں کوئٹہ آئی۔ اسے ایک 'چھوٹو' چاہیے تھا اپنے ساتھ گھمانے کو، اپنی مدد اور ساتھ دینے کو۔ چنانچہ اس نے مجھے ساتھ لیا۔ اُس کی واقفیت بہت تھی۔ ساری بیوروکریسی ایک عمدہ شاعرہ کے بطور اُس سے واقف تھی۔ پھر ایک حسین وجمیل خاتون شاعرہ، جو فیور لینے آئی تھی۔ مجھے ایک دو بڑے افسر اب بھی یاد ہیں جو کہ پوری ملاقات میں چمکتی دمکتی پائپ میں ایمفو را تمباکو کے کش لگا لگا کر

خوشبو بکھیرتے رہے۔ بہر حال جتنے دن وہ یہاں رہی میں اُس کا فرمانبردار خادم بنا رہا۔ مجھے نظریے کی بیماری جو لاحق تھی۔ (یا اُسے کمان کرنا اچھا آتا ہے!!)۔

اس کی بلوچ دوستی کے لیے ایک چھوٹی سی مثال اس کا یہ کلام ہے:

ویرانہ میں پیر پیادہ کرتی گھات بلوچ کی
ایک پنھل کے کارن میں تو باندی ذات بلوچ کی

مرے پنھل کو کیا رو کے گی زنداں کی دیوار
بھور سمے آکاش کی لالی دیتی ہے دیدار
کیچ کوٹ میں بھڑک بھڑک کر بیتی رات بلوچ کی
وہ الاؤ تھا رات بھی بن گئی باندی ذات بلوچ کی
سب کا ہوگا بھور اُجیارا ، کالی رات بلوچ کی
اس دھرتی کو یاد رہے گی، ساری رات بلوچ کی
سسی سہاگ بنے گی تیرا ، بھاری رات بلوچ کی

اِس کوئٹہ ملاقات کے بعد ایک بار پھر، بے پرواہ، اور، بہت کام والی فہمیدہ ایک لمبے عرصے کے لیے عنقا ہوگئی۔ بس شاعری کے ذریعے ڈھلمل یقین لوگوں کا ایمان تازہ کرتی رہی۔

فہمیدہ کی شاعری، فیوڈل اردو پر، بغاوت کے اتنے زیادہ اور اتنے گہرے کرپان گھونپتی رہی ہے کہ اب اردو 'اِن، اُن' جیسی اشارہ بازیوں کے مریخ سے اتر کر انسانوں کی زبان بنتی جا رہی ہے۔ گو کہ یہ ابھی تک فارسی والے آئی ایم ایف قرضے میں گردن گردن ڈوبی ہوئی ہے (اور اس پر اردو والے اِتراتے بھی بہت ہیں)، مگر فہمیدہ نے گلی کے عام محنت کرنے والے ماوشما کی روزمرہ بول چال کا سونا چاندی ڈال کر اس غیر مستحسنی کو اچھے خاصے انسانی جامے پہنائے ہیں۔ اردو کے 'عالیہ پن' کا ہماری قومی زبانوں کے اپاہج بنانے میں بہت رول رہا ہے۔ فہمیدہ جیسے لوگ جب

پاکستان میں زبانوں کے تھانیدار اردو، ہی کو عوامی بنا رہے ہیں تو یقیناً ہماری دوسری قومی زبانیں بھی ہوائی جہاز پہ چڑھنے کی بجائے نیچے اپنے عوام میں ہی رہیں گی۔

فہمیدہ (بنتِ ریاض الدین احمد وحسنہ بانو) کسی بہت بڑی انقلابیت میں مبتلا نہ رہی۔ بڑی بڑی اصطلاحات سے گریز کرتے ہوئے بھی، اس نے نہ کبھی مارشل لا کو بخشا اور نہ ملّا کو، اور نہ فیوڈل کو۔ اس ملک میں محکوم قوموں کے حقوق تو اُسے پیارے رہے ہی ہیں مگر اُس کا اصل میدان دوہرے تہرے استحصال کی شکار، عورت ذات رہا ہے۔ لیکن فہمیدہ کے اندر امتیازی بات یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ عورتوں کی تحریک کے نام پر فرقہ بنانے کی سخت مزاحمت کی ہے۔ اس کے ہاں، عمومی عوامی اور جمہوری تحریک سے جوڑ کر عورتوں کی تحریک اپنے تبرک وتقدس کا پرچم ہوا میں پھڑ پھڑاتی رہی ہے۔

ایک اچھے دانش ور کی طرح وہ نئی نئی بحثیں چھیڑتی ہے، نئے نئے سوال اٹھاتی ہے۔ جس وقت (اور دراصل ہمہ وقت) پورا سماجی دھارا اپنی نکیل ملاّ کے ہاتھ میں دے کر، منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے آخرت بچانے رواں دواں ہوتا ہے تو فہمیدہ کوئی دنیاوی بات چھیڑ کر اُس کا سرور توڑ دیتی ہے۔ کتنا تکلیف دِہ ہوتا ہے سرور کا بے وقت ٹوٹ جانا۔ کچھ گالیاں تو پھر آئیں گی ہی

۔

ہیں ناں؟!

حوالہ جات

1- ریاض، فہمیدہ۔ خطِ مرموز۔ 2002، سٹی پریس بک شاپ کراچی۔ صفحہ 108

2- اب کی بار۔ دنیازاد، نمبر 21۔ صفحہ 117

3- کشور ناہید کی نوٹ بک، سنگ میل پبلی کیشنز، صفحہ 36

4۔ ریاض، فہمیدہ۔ خطِ مرموز۔ 2002۔ سٹی پریس بک شاپ، کراچی۔ صفحہ 116

کیاتم پورا چاند نہ دیکھو گے؟

یہ فہمیدہ ریاض کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں 1980 کی شاعری شامل ہے۔اِس کو پڑھنا شروع کریں تو پہلا تاثر تو یہی ملے گا کہ اس میں بھی شاعرہ نے ہندی کی زبردست آمیزش کی ہے۔گو کہ یہ آمیزش جمالیاتی گز پر پورا اترتی ہے مگر فہمیدہ کے قارئین کا بڑا حصہ تو اُس خطے میں رہتا ہے جو ہندی سے زیادہ بلد اور عادی نہیں ہے، لہٰذا اِس کتاب کی اُس کی شاعری کا ابلاغ آدھا ہی ہوسکا ہے، اُس کے قارئین کا نصف تو اسے پڑھ ہی نہ پایا۔

اگر اُس کی شاعری کا ارتقائی جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ وہ یہاں شعوری طور پر مزید میچور ہوتی جا رہی ہے۔ایسی خوبصورت فلسفیانہ باتیں اُس کی مزین وجمیل شاعری میں شامل ہو رہی ہیں جو بہت زیادہ خوش آمدید کی مستحق ہیں:

کیا تو بھی......
میری شاعری، تو بھی؟
منہ پھیر لے گی؟ آنکھیں چرائے گی؟

کیا تو بھی نصیحتوں کے نقشین کٹوروں میں
بے حیائی اور آبروریزی کی نپی تلی خوراک پیش کرے گی؟
میرے ہمدردوں اور خیرخواہوں کی مانند
جو اس تپتی دوپہر میں
اپنے خُنک کمروں میں محوِ آرام ہیں

فہمیدہ کے تخلیقی سفر پر نظر دوڑایے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے فکری تسلسل میں ہمہ وقت آگے کی جانب رواں دواں ہے۔سرمایہ داری نظام کو مسترد کرنے کا اُس کا اولین طے کردہ مقصد روز بروز منطقی اور مدلل ہوتا جاتا ہے۔سرمایہ داری نظام جہاں رات رات کو جن رہی ہے، جہاں کی موسیقی محض چیخیں کراہیں ہیں، جہاں پیدائش کا عمل مسخ کر دیا گیا ہے، جہاں بازاروں میں چمکتی درآمدی اشیا کی شہوت چہار سو موجود ہے، جہاں شہروں کے بے حرمت جسموں پر پلازوں اور مشینوں کے پھوڑے نکل رہے ہیں، جہاں حرامزدگی اور ایذارسانی کی رسی دراز ہے، جہاں زندگی دلیل اور شاعری کے منہ پر تھوک رہی ہے۔میں اور آپ سرمایہ داروں سے نفرت کے ہزار جملے اور بے شمار کتابیں پڑھ چکے ہوں گے۔مگر فہمیدہ کا تجربہ بالکل انوکھا لگتا ہے۔اُس نے سرمایہ دار کی تعیش بھری زندگی کو کس طرح لیا، ذرا دیکھیے:

اور چیتھڑے تو یہ اب بھی ہیں
کرسیوں سے بندھے ہوئے
ہر صبح کوئی پُراسرار ہاتھ دیوار سے اُگتا ہے
اُن سے اُن کی کرسیاں چمکا کر
انہیں پھر واپس باندھ دیتا ہے
کہ یہ دن بھر سرسراتے اور پھنکارتے رہیں

کیا راست باز، کھری بے لاگ شاعرہ ہے، کیا اچھی شاعرہ ہے۔ کیا زبردست مشاہدہ ہے ۔ وہ یہاں بس نہیں کرتی، اس نے ابھی اور کہنا ہے، کہتے رہنا ہے۔ ایک اور جگہ دیکھیے:

تجوریوں پر براجمان ساہوکار
گندی دھوتیوں کی گانٹھ میں باندھے بیٹھے ہیں
اور پیلے دانت نکالے
کھجا رہے ہیں پھوڑوں بھری رانیں
نوزائیدہ انسانیت کی عصمت دری کرنے کو بے تاب

پانچ ابواب میں منقسم کردہ یہ شعری مجموعہ مارشل لائی پاکستان کا واضح ترین اور سب سے زیادہ تشریح شدہ بیانیہ ہے۔ اس سے بہتر بیانیہ نہ نثر میں ممکن ہے، نہ نظم میں۔ ''نہیں بیٹھی ہوں سمجھوتوں کے سائبانوں میں'' کی شاعرہ مثلاً اِس کے عدالتی نظام کے بارے میں یوں کہتی ہے۔

وکیل کا کیریکٹر پہلے دیکھیے:

کالے کوٹوں میں وکیل
منڈیروں پر کائیں کائیں کر رہے ہیں
بھوکے بچے کے ہاتھ سے نوالہ جھپٹنے کو تیار......

کاش وکیلوں کی تحریک کے دوران یہ صادق شاعری بھی اسی زور شور سے سنی سنائی جاتی جتنا اعتزاز احسن کی ریاست کو ماں بنانے والی فضول آرزو کو سنایا دہرایا جاتا رہا۔

اور پھر فہمیدہ کی تیز و عمیق مشاہداتی آنکھوں سے انہی عدالتوں میں دیمک زدہ منشی، اہلکار اور افسر کا کردار دیکھیے:

افسروں کے بوٹوں تلے روز کچلی جاتی ہیں
بے اختیار، بے بس کٹھ پتلیاں!
مگر......ان کے بس میں کچھ تو ہے
یہ تمہارا خون چوس سکتے ہیں

تمہارے فق چہرہ کو دلی مسرت سے بھانپتے ہیں
اور تخمینہ لگاتے ہیں......
''کس میں لہو کی بوند بچی ہے!''
''اسے میں کس طرح چوسوں!''

اور پھر وہ آپ کو اِس فرعونی عدالتی نظام کے اندر عوام سے عوام الناس سے، خلقِ خدا سے ملواتی ہے:

کیا تم نے کبھی عوام کو دیکھا ہے؟
کیا تمہیں کبھی وہ
حکمراں کی تقریر
اور اخبار کی سرخی سے باہر ملا ہے؟
اگر نہیں......
تو کسی دن سٹی کورٹ آجاؤ
اسی میدانِ حشر میں وہ پابہ زنجیر ایستادہ ہے
اور اُس پر
غنڈہ گردی، چار سو بیسی اور نقصِ امن کے مقدمات
زیر سماعت ہیں

یہ تو تھا عدالتوں کا منظر نامہ۔ یہ اُس نے محض پڑھا نہ تھا، نہ کسی سے سن رکھا تھا۔ یہ تو خود اُس پہ بیتا تھا۔ اُس نے خود اپنی اَنا پہ بھگتا تھا۔ وہ عدالتوں میں گھسیٹی جاتی رہی۔ آیئے اب اُس کی اپنی پیشی کا نظارہ دیکھیے:

میں نے شعر لکھا
اپنے آنسوؤں سے!

بلک بلک کر لکھا
خون کی بوندوں سے نقطے ڈالے
اپنے گوشت کو چیر پھاڑ کر ریشے نکالے
اور انہیں قافیہ میں باندھا
بے بسی کے ناخنوں سے
میں نے اپنی ہتھیلی پر شعر گودا
اور تمہیں دِکھایا
تم غلیظ ہنسی ہنس پڑے
''آہاہا............ننگی شاعری!''
تم نے کہا،
اور میرے کلام سے فحاشی کرنے لگے
میں سر پٹکتی رہ گئی
میں سر پٹکتی رہ گئی
ان گیلے دعوت ناموں پر
جو بے حیائی سے مجھے بلا رہے تھے
تمول کی چربی پر پھسلنے کے لیے
اور تمہاری مرغن محفلوں میں جا گرنے کے لیے

ابھی کہاں؟ ۔ابھی تو اُس نے صرف اس نظام کو بیان کیا۔ اس کی سیاست ، اس کی معیشت اوراس کے عدالتی نظام کو بیان کیا۔ ابھی اُس نے اِس دوغلے سسٹم میں اپنی Placing کرنی ہے۔

تو سنو:

میں جب شکست خوردہ تھی
حالات کے پنجے میں بے بسی سے اشکبار

تب تم میری داد دیتے نہ تھکتے تھے!!
لیکن اب......
جب میں نے جھٹک دیا ہے ناطاقتی کو
اپنے بازوؤں سے
اور موڑ دیا ہے حالات کا پنجہ
اپنی نہتی کلائی کے بل
جب میری جنم جنم کی حسرت نے
اپنی دھرتی کی محرومیوں کی جانب دیکھا
اور روتی ہوئی یوں اُن کے گلے جا لگی
جیسے بیٹی بچھڑی ماں سے لپٹ جائے
تم اتنے خوفزدہ ہو گئے ہو!
تم نے میرے پیچھے پولیس لگا دی ہے!!
سمن اور وارنٹ جاری کرتے ہو!!
اپنے سارے خوف کی رسیوں کو بٹ کر
مقدموں کی پھانسی میرے سر پر جھلانے لگے ہو!!

آپ لاکھ آزاد عدلیہ بولیں، ''ریاست ہوگی ماں کے جیسی'' والی لفاظی کی جگالی کرتے پھریں، نظام بدلنے کے بجائے ایک پی سی او والے جج سے من وسلویٰ مانگتے رہیں، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ ایک طبقاتی سماج میں ریاست ہمیشہ اقتدار والے طبقہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ ریاست کبھی بھی ماں نہیں بن سکتی جب تک کہ خود اُس کی آنکھیں پھوڑ نہ دی جائیں، اس کا دل نکال کر اُس میں عوام دوستی کا اسٹیشن نہ بنایا جائے۔ ریاست پہ عوام کا قبضہ کیے بغیر ریاست ہمیشہ ڈائن رہے گی، کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ حتیٰ کہ اس کو ہم نے 'ڈائن ماں' بنے ہی دیکھا ہے۔ عدلیہ، ریاست کا دست و بازو اور اسلحہ و ہتھیار ہوتا ہے، اس لیے عدلیہ ہمیشہ برسرِ اقتدار طبقے کی طرف دار ہوتی ہے۔

کوئی اور جانے نہ جانے مگر، فہمیدہ خوب خوب جانتی ہے کہ:

سب کچھ جوں کا توں رکھنے کے لیے
تم نے ٹینک لگا دیے میری سڑکوں پر !
سب کچھ جوں کا توں رکھنے کے لیے
تم نے بندوق تان لی میرے سینے پر!

فہمیدہ اپنے خیالات میں بہت واضح ہے۔ اور وہ عوام الناس کی ترجمان ہے۔ اُسے ساختیات و پس ساختیات و ذات کی صلیب و اندر کی آزادی جیسی باتیں لغو لگتی ہیں۔ سیدھی بات کرتی ہے اور سیدھی بات یہ ہے کہ:

اور پھر کہا،
''لکھو...........خلقت کا نام لے کر
جو زمینوں پر محیط ہے
اور زمانوں تک رواں ہے
جو عظیم ہے اور کبیر ہے

فہمیدہ کلیشے جگالی نہیں کرتی۔ ظالم و مظلوم کے بیچ جنگ میں وہ بازاری پن اور غیر سنجیدگی نہیں کرسکتی:

میں گواہی دیتی ہوں
اپنے مظلوم لوگوں کی دلیری کی
میں گواہی دیتی ہوں
ان کی فتحِ مبیں کی
میں گواہی دیتی ہوں!

......اور وہ میں کون ہے؟۔ جب حق و باطل کا معاملہ ہو تو وہ میں تو آپ ہیں، میں ہوں، وہ ہے، اور ہم سب ہیں:

میں انسان ہوں......ایک انسان
جانتے ہو؟ انسان کیا ہوتا ہے؟
سنو، اور خوف سے پیلے پڑ جاؤ
انسان......شہید کا امکان ہے

آہا! کیا حسین و لطیف نتیجہ ہے۔ اس بے آسرا سماج میں انسان برباد ہے۔ اسی لیے تو فہمیدہ ایک ہستی کو نہیں بھولتی۔ اُس بڑی جنگ میں اُس ہستی کی مدد اور حمایت بہت ضروری ہے۔ وہ مظلوموں کی جدوجہد میں اُن کی امید، اُن کی ڈھارس اور ان کی پشت بان ہے۔ مظلوم کی آہ اور پکار ہے۔ وہ اُس منصفِ کائنات کو یوں پکارتی ہے:

مصنفِ کائنات! اپنی دوزخ کے در کھول دے
تیرے عذابوں کے مستحق
ان سے بڑھ کر کون ہیں؟
کہ جس سرمایہ پر انہوں نے ہاتھ صاف کیا
وہ تو مسکینوں کا تھا!
مجبوروں اور بے سہاروں کا!
مفلسوں اور ناداروں کا!

کبھی تم نے ایک میز پر بیٹھ کر
سرکاری مخبر کے ساتھ......چائے پی ہے؟
جب وہ بھی جان لے
کہ تم جانتے ہو
وہ بات کہ تم کہہ نہیں سکتے
پھر بھی وہ سن سکتا ہے

پھر چائے کی پیالیوں میں کیا رہ گیا؟
کیا برف کا ٹکڑا؟
اسے حلق سے اتارنا ہے
ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہو
اور وہ بے چارہ، پیٹ کا مارا
تم سے بڑھ کر مضطرب نظر آتا ہے
زیادہ تربیت یافتہ نہیں شاید!
اے خدا، عزتوں اور ذلتوں کے
مخبری کی تربیت کے لیے
کتنا ایک عرصہ کافی ہوتا ہوگا؟
ایک سال، ایک دن؟
یا ایک لمحہ، دباؤ سے کمزور پڑا؟
کیا یہ ممکن نہ تھا
کہ تم اسے نہ پہچانتے
کیا یہ کہیں زیادہ بہتر نہ ہوتا؟
مگر اب تو وہ پھیکی ہنسی ہنستا
رنجیدہ آنکھیں پھڑ پھڑاتا
باتیں کیے جاتا ہے، کیے جاتا ہے
یہاں تک کہ تمہاری بے چینی
تھکن سے پتھرا جائے
یہاں تک کہ تمہیں رونا آنے لگے
اور ہاتھ پھڑکنے لگیں

اسے جھنجھوڑنے کے لیے، چیخیں مارتے ہوئے
بدنصیب! بدنصیب

اب میں آتا ہوں اپنے نتائج پر۔ آپ کو یاد ہے پیچھے کہیں میں نے کہا تھا کہ فہمیدہ کا مجموعہ ''بدن دریدہ'' اُس کی بہترین کتاب ہے۔ مگر اب تو اُس کا مجموعہ ''کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟'' بھی سینہ ٹھوک کر آمنے سامنے آ گیا۔

بدن دریدہ نے مجھ سے میرے سابقہ فیصلے پر قائم رہنے کے بھروسے پہ کہا، ''میں اچھا!'' 'تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟' نے کہا، ''نہیں نہیں۔ تم بہت فرسودہ زمانے کی تخلیق ہو۔ مجھے مزید سیاحت، مزید مطالعہ، مزید ٹکنالوجی اور مزید تجربے کی نعمت حاصل ہے۔ اس لیے میں اعلیٰ''۔

میں حیران کھڑا ہوں کہ کسے افضل قرار دوں، کسے عزیز کہہ دوں...... کہ 'تسلسل' میں ادنیٰ اعلیٰ کی تفادت مجھے جائز نہیں لگتی۔

ہم رکاب

اس پانچویں مجموعے میں اُس نے یہ ذیلی سرخی لگادی: جلا وطنی کی نظمیں۔ یہ مجموعہ مارچ 1981 سے لے کر 1987 تک کی شاعری پر مشتمل ہے۔

'ہم رکاب' نامی مجموعے میں خالدہ حسین نے فہمیدہ کی شاعری کے اندر رفتار، لپک جھپٹ اور چستی وپھرتی میں کمی محسوس کی ہے۔شاید ایسا ہو۔مگر سچی بات یہ ہے کہ یہاں بھی اس کی سوچ وفکر کا مومنٹم جاری رہا، پروجیکٹائل قوت سے ہی سہی۔اس لیے کہ ابھی وہ دھرتی ہلا ڈالنے والی عالمی آزمائش کی گھڑی آئی نہ تھی جس میں سندیافتگان تک کے لنگوٹے سیلاب برد ہوئے مگر جہاں اِس عورت کا ایمان سلامت رہا۔ایک بڑی آزمائش ابھی آنی تھی جب مشرقی یورپ میں سوشلسٹ ممالک بغیر سورج کی حدت کے پگھل گئے۔..........مگر خالدہ جی کا شاید یہ شعبہ نہ تھا۔

'ہم رکاب' کی شاعری کا یہ عرصہ فہمیدہ کے لیے خود تنقیدی کا عرصہ ہے،خود کو دوبارہ دیکھنے کا وقت۔وہ اپنے تعاقب میں پھرنے والے ہجومِ سنگ زناں کے ہونے نہ ہونے کا پوچھتی ہے، اپنے چہرے پہ پڑی ضربوں، نیلوں، سوجھنوں کو گنتی ہے، اپنے کاسہِ سر کو خون سے تر ہونے کی تصدیق تردید

پر کام کرتی ہے۔مگر اُس عزم کو دیکھیے جو تسلسل کے ساتھ اس مجموعے میں بھی موجود ہے:

بچنے کی تو صورت خیر نہ تھی
درماں کا ہی چارہ کر لیتے

پاگل۔جو لوگ درمان کا چارہ کرنے کا سوچتے ہوں، وہ خود کو بچا لینے کی ترکیب بھی کر ہی لیتے ہیں۔تم نے نہ بچنے کی کوشش کی اور نہ ہی درماں کی۔اِسی لیے تو برگزیدہ ہو!

مصفانہ سماج کے قیام کی زبردست تڑپ والی اُس کی نظم ''اب اتنی رات گئے اے دل' اسی مجموعے میں تو ہے۔جلا وطنی میں تو ہر سمت بکھرے پتھروں کی بے فکر ہنسی سے واسطہ پڑتا ہے۔ہر گنبد، بے گونج گنبد ہوا کرتا ہے۔ظاہر ہے وہاں لہجہ تو بدلے گا ہی۔وہاں تو انسان درد بدوش، خانہ برباد، بے جادہ، بے منزل، جُز خلقِ وطن کا خونچکاں دل بن جاتا ہے، وہاں پارۂ شعر پرزۂ جاں بن جاتا ہے۔لہجے کے اس فرق کو مایوسی کہنا، یا سست رفتاری پہ منطبق کرنا درست نہیں ہے۔بے چین روح کی مالکن فہمیدہ سست رفتار کبھی ہو نہیں سکتی۔وہ تو جگنو کو انسانوں کے درمیان لانے کے لیے ہائی جمپ کرتی رہتی ہے۔ایک دنیا، جہاں حافظ شیرازی کے زمانے سے بڑھ کر فتنہ وشر، روزِ بتر، طوقِ طلا ،گردنِ خر، خونِ جگر، دیدۂ تر ہی معروض ہو تو شاعر وہی کچھ تو لکھے گا۔اُسے رفتار میں کمی سے تعبیر کرنا غلط ہے۔

یہ تاثر قطعاً درست نہیں کہ فہمیدہ کی فکری رفتار میں سکوت آ گیا۔اس کی نظم ''ہم رکاب'' اس کی گواہ ہے:

اشک پیتے ہوئے، گنگناتے ہوئے
زخم کھاتے ہوئے مسکراتے ہوئے
کچھ سنبھلتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے
پیش پا قافلے!
ہم ترے، ہم رکاب

یہ جو انسانی وقار کے قافلے کے اندر ہم رکابی، ہم سفری، ہم گامی کا رفیقانہ مقابلہ ہے نا، یہ

بہت مقدس نعمت ہوتی ہے۔ فہمیدہ نے بھی خود کو اِسی جذبے کی ضمانت کے سپرد کر دیا۔..........ضامن بہت معتبر نکلا۔

آگے چلیے۔ فہمیدہ تو مصیبتوں، عدالتوں کے چکروں، اور بدنامیوں کے سمندروں، صحراؤں سے گزر کر بھی اعلان کرتی ہے:

جب تلک ہے دم میں دم
پھر وہی کریں گے ہم
ہو سکا تو کچھ بڑھ کر
پھر وہ حرف لکھیں گے
تیرہ زاد ہر آمر
کانپ اُٹھے جسے پڑھ کر
پھر وہ گیت چھیڑیں گے
بستہ دست ہر مظلوم
جھوم اُٹھے جسے گا کر

کاش قوتِ متحرکہ بننے والی ہر بات ہمارے لیے محض جھومنے کا موجب بات نہ بنتی۔ اب تو صورت یہ ہوگئی کہ انقلاب پکار پکار کر بلا رہا ہوتا ہے اور ہم رقصِ درویش کو اُس کا بدل سمجھنے میں غرقاں ہیں (کبھی جمہوریت پسند بن کر پاکستان کے آئین کو آنکھوں سے لگا کر ریاستی اداروں کے تقدس کی تلقین کرتے پھرتے ہیں، اور کبھی صوفی بن کر صوفی موسیقیاں منعقد کروا کر لٹو کی طرح جھومتے رہتے ہیں)۔ جبر وحبس، مرگِ بسمل بننے کو دھکیلے اور ہم پُر سرور اور موت کی حد تک نرم گامی کا رومی کا وِرد اور رقص کر رہے ہیں۔ فہمیدہ جیسوں کی دوا میں اثر کیوں نہیں ہے۔ ڈھونڈو، لوگو وجہ ڈھونڈو..........کہ شاید ساری برائی کی جڑ یہاں ہو۔

ہم اُس کی شہرۂ آفاق نظم ''چادر اور چار دیواری'' کا تذکرہ پہلے ہی کر چکے ہیں۔ وہ تو اِسی مجموعے کی نگینہ نظم ہے۔ اگر اُس صدی میں انسانی فلاح کے قافلے کی ساری زبانوں کی دو درجن

نظمیں الگ کر دی جائیں تو معیار کے اعتبار سے 'چادر اور چار دیواری' بلاشبہ اُس انتخاب میں شامل ہوگی۔ چیلنجنگ، ڈفاینٹ، جرأت مند، مصمم، اٹل، اور باغی نظم۔ زندگی سے بھرپوریت اور 'شیموش' کا عملی نمونہ۔

''خانہ تلاشی'' نامی اُس کی نظم کا عنوان ہی آپ کو جامہ تلاشی کے اُس سیاہ دور میں لے جائے گا جو بدقسمتی سے اس ملک کا طویل ترین دور رہا ہے۔ ایسا عہد جس میں عوامی امید اور ڈھارس کے سب ذرائع اُس سے چھین لیے گئے۔ مگر فہمیدہ پہلے تو ایمان والا یہ عہد کرتی ہے: ع

اے گزرتے پل! تیری پامال حرمت کی قسم

اور پھر عہد کرتی ہے کہ: ع

فصیلِ شہر پہ نئے مضمون رقم ہوں گے

''کوئی ماں انقلابی بیٹے سے'' والی نظم یہیں پر ہے، ''نذیر عباس کی شہادت پر مقدمہ'' اسی کتاب میں ہے، ''بارو چا'' اِدھر ہی ہے، ایاز سموں کا جی دار قصہ اسی مجموعے میں ہے......حتیٰ کہ اُس کی خوبصورت ترین انقلابی اور باغیانہ نظم ''تعزیتی قرار دادیں'' بھی اسی کتاب کا حصہ ہے۔ (میں اِس نظم کا بہت بڑا مداح ہوں!)۔

****

فہمیدہ ریاض 91_1990، کے دوران آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان کی مشیر کے بطور کام کرتی رہی۔ وہ 1994 سے 1997 تک منسٹری آف کلچر گورنمنٹ آف پاکستان کی مشیر رہی۔

آدمی کی زندگی

یہ اس کا چھٹا اور اب تک شائع شدہ آخری شعری مجموعہ ہے۔ اس میں 1988 سے 2000 تک کے برسوں کا کلام شامل ہے۔

وہی نہ سُدھری، نہ پالتو شدہ اور نہ بکی ہوئی شاعری۔ فہمیدہ زمانے کے اتار چڑھاؤ سے شخصی طور پر بہت متاثر ہوئی۔ مگر، زور آور کی ٹھوکروں سے شرق و غرب جُھولتی شاعرہ اپنا ڈکرانا کبھی بند نہیں کرتی۔ خلقِ خدا کی ارواح سے اپنی روح کے میل میلاپ پر کبھی ناکہ نہیں ڈالتی۔

''اس شہر میں'' نامی نظم ایک عام انسانی مسئلہ کو اجاگر کرتی ہے:

اس شہر میں، میں اجنبی یوں نہ تھی میرے خدا
اس کی زمیں، اُس کے فلک، اس کی ہوا کو کیا ہوا؟
پہچان میں آتا نہیں، پہچان بھی پاتا نہیں مجھ کو کوئی

بدلا ہوا سارا سماں
ہے روشنی اتنی مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں
گھر تھے یہاں
رہتے تھے جن میں کچھ مکیں
اک پیڑ تھا اِس جا کھڑا
جھولا پڑا تھا ڈال پر
اک دوست رہتا تھا یہاں
کیوں مٹ گئے سارے نشاں؟
اب تو فقط ہر موڑ پر، ہر گام پر
بازار ہے، بازار ہے، بازار ہے

فہمیدہ کا فکری تسلسل بہت اہم اور قابلِ دید ہے۔ سوویت زوال کے بعد جو افراتفری ہماری صفوں میں مچی، اس نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ سیکڑوں، ہزاروں بچھڑ گئے اور سرکتے سرکتے اُس جگہ پہنچے جسے وہ زندگی بھر ذلالت کا کھڈ کہتے رہے تھے۔ کئی لوگ ''اُس کی بات سننے میں کیا حرج ہے؟'' کے تکیہ کلام والے بن گئے اور بہت دوسرے شام ڈھلے اپنی جون بدلنے لگے۔

سایہ تک جدا ہو جانے والی بدبختی کے زمانے میں جو لوگ اپنے مؤقف پہ کھڑے رہے، اُن میں سے آدھے وہ تھے جو اپنی عمروں کے دو پہر گزار چکے تھے اور اب سمتیں قبلے تبدیل کرنے کی نفسیاتی اور جسمانی حالت میں نہ تھے۔ کچھ فکری تساہل میں ہل جل کے قابل نہ تھے۔ کچھ ایسے جنہیں تعریف و توصیف کی صورت، یا پھر طنز و تشنیع سے حاصل ہونے والی توصیف کی صورت اپنے سوشلزم کے ساتھ جڑے رہنے کا معاوضہ ملتا رہا۔ محض، ایک آدھ فیصد جینوئن مال بچ گیا تھا۔ میں آپ کو دِکھاتا ہوں کہ اس سیاہ بحرانی دور میں ہم نے ایک دوسرے کو کس طرح حوصلہ دیے رکھا تھا۔ بھئی، ''مجسمہ''۔ ہاں ناں، فہمیدہ کی وہ نظم جو مرتی ہمتوں اور نحیف و لاغر استقامتوں کے لیے وٹامن سے بھری بوری ثابت ہوئی تھی۔ ہم نے اُس زمانے میں اُس نظم کو اپنے رسالے کا سرورق بنا دیا تھا۔

دوسروں کے لیے کم، اور خود کو ہمت و جرأت دلانے زیادہ!۔ ہم آج بھی سوشلزم کے ساتھ وفا جاری رکھنے والا تحسین واطمینان کا جو تمغہ سینوں پہ لگائے پھرتے ہیں، اُس میں اِس نظم کا بڑا ہاتھ ہے۔

ہم اپنی محسن نظم کو یہاں نقل کرتے ہیں۔ ایسی نظم جو ایمانوں کی سلامتی کا باعث بنے، اُس کی قیمت بھلا کیا ہو سکتی ہے!:

(ماسکو میں لینن کا مجسمہ گرانے پر)

مجسمہ گرا دیا
مگر یہ داستاں ابھی تمام تو نہیں ہوئی
کئی ورق سفید ہیں
لکھے گا جن پہ آدمی
ایک اور بابِ جستجو
کہ حسن کی تلاش میں
کہ منصفی کی آس میں
پھری ہے خلق کو بہ کو

دکاں میں کتنا مال ہے
دکاں میں دلبری نہیں
دکاں میں منصفی نہیں
ابھی پہر ڈھلا نہیں
ابھی رواں ہے کارواں
دلوں میں نصب ہیں نشاں
مجسمہ گرا مگر

زمیں پہ زندگی، دکاں کے نام تو نہیں ہوئی
ہماری داستاں ابھی تمام تو نہیں ہوئی

ناول ماں، ناول غدار، اور ناول سپارٹیکس جیسی ایمان پرور نظم۔ ایک ایسی نظم جو وقت کے باسی ہونے کے سبب شاید آج اپنی اُس اہمیت کو جتا نہ سکے جو اُسے اس وقت حاصل تھی جب آزادی اور نجات کے کامران قافلے کا دل پھٹ گیا تھا۔ پورے مشرقی یورپ نے خود کو پرچون کی بے ہودہ دکان کے در پہ سجدہ ریز کر دیا تھا؛ بے وضو، بے غسل، بے ثواب، بے معاوضہ۔ یوں ایک عمومی احساسِ شکست، بددلی اور بے بسی چھائی ہوئی تھی، مقصدِ جہد وحیات دُھند میں مبہم پڑ گیا تھا، صفیں بری طرح بکھر چکی تھیں، اور انسان اندر سے بکھر چکا تھا۔

تب یہ نظم ملی تو یک دم ترانہ بن گئی، لاکھوں انسانوں کا نہ سہی، ہزاروں سیکڑوں کا نہ سہی، درجنوں کا نہ سہی، ایک میرا تو یہ ترانہ بن گئی تھی۔ فیس بک نہ تھا، ای میل، انٹرنیٹ عام نہ تھا، اپنے پاس کوئی میڈیا ہاؤس کوئی روزنامہ نہ تھا۔ محض ایک رسالہ تھا جو پانچ سو کی تعداد میں چھپتا تھا۔ اُس کے ٹائٹل پہ یہ نظم جگمگائی تھی۔ اگر ہمارے دو قاری بھی اس سے متاثر ہوئے ہوں گے تو آپ اندازہ کریں کہ اس لائف سیونگ نظم کی کتنی اہمیت تھی............اور نظم کی خالق تو اُسی دن سے اُچھل کر ہماری آنکھوں میں سما چکی تھی۔ (اپنی تمام تر بے چینی کے باوجود وہ ابھی تک اتر نہ پائی ہماری پلکوں سے)۔

اُس کی ایک اور نظم بھی اِسی مجموعے میں شامل ہے: داروغہِ زنداں۔ پڑھو، اور مشورہ دو کہ کیا ہم استواری کے ساتھ وفاداری کا نام فہمیدہ نہ رکھیں؟۔ دیکھیے ناں! بڑی جیل ہو یا چھوٹی اُس کے داروغہ سے محبت کیسے ہو سکتی ہے۔ اور پھر ہمارا تو ملک ہی جیل خانہ ہے۔ فہمیدہ کی ''داروغہِ زنداں '' سے یہ ٹکڑا دیکھیے اور یہ فیصلہ کیجیے کہ اُس نے یہ نظم سنٹرل جیل کے داروغہ پر لکھی یا ملک کے داروغہ پر، یا دونوں پر۔

داروغہِ زنداں عریاں ہیں
لیکن ان کو کچھ باک نہیں

یہ کہہ کے تبسم کرتے ہیں
جو خلعت ہم نے پہنی ہے
اس خلعت کا اعلیٰ ریشم
عامی کو نظر آئے کیوں کر
جب اس کی بصارت پاک نہیں

اپنا ایک مشاہدہ یاد کیجیے!۔ آپ کے ذہن میں بھلا کوئی ایسا اچھا دانش ور ہے جو ملاّ کے خلاف نہ بولا ہو؟۔ جینوئن دانش وروں کے ٹیسٹ کی چیز ہے، پادری و پنڈت و ملا سے اپنے عدم اتفاق کا اظہار۔ شاہ لطیف، شاہ عنایت، مست توکلی، خوشحال، گل خان............ انھی سچے سُچے دانش وروں کی پاک پیروی ہماری اِس شاعرہ نے بھی کی اور کیا خوبصورتی سے کی:

میں عازمِ مے خانہ تھی کل رات کہ دیکھا
اک کوچہ پرشور میں اصحابِ طریقت
تھے دست و گریباں
خاکم بدہن، پیچ عماموں کے کھلے تھے
فتوؤں کی وہ بوچھاڑ کہ طبقات تھے لرزاں
دستانِ مبارک میں تھیں ریشانِ مبارک
موہائے مبارک تھے فضاؤں میں پریشاں
کہتے تھے وہ باہم کہ حریفانِ سیہ رُو
کفار ہیں بدخُو
زندیق ہیں، ملعون ہی بنتے ہیں مسلماں

ہاتف نے کہا رو کے کہ اے ربِ سماوات
لاریب سراسر ہیں بجا دونوں کے فتوات

خلقت ہے بہت ان کے عذابوں سے ہراساں
اب ان کی ہوں اموات!

سب کہو آمین (مولنا عبداللہ درخواستی صاحب کا تکیہ کلام)۔ ''دستانِ مبارک میں ریشانِ مبارک'' کس قدر خوبصورت ترکیب ہے............ اور پھر ''اب ان کی ہوں اموات!'' کس قدر بے ساختہ، اتھاہ دل کی دعا ہے!!۔

ملاّ کے علاوہ، بیوروکریٹوں سے بھی بھلا کس شریف انسان کو نفرت نہیں رہی ہوگی۔ بالخصوص اُن بیوروکریٹوں سے جو قلم کار بھی ہیں۔ پورے مارشل لا عہد میں یہ اے سی ڈی سی، ڈائریکٹر، سیکرٹری، کمشنر، گورنر اور جج جسٹس خلقِ خدا کو کوڑوں، سنسرشپوں، پابندیوں، دفعہ ایک سو چوالیسوں کے حکم ناموں پر دستخط کرتے رہے تھے۔ یہ جابر و قہار بیوروکریٹ دو چار افسانے، نظمیں یا کالم لکھ کر عوامی ترجمان بھی بنتے ہیں۔ اس 'ایک ٹکٹ میں دو مزے' کرنے کے خلاف تاریخ نے تو کچھ بھی نہ کیا۔ ہمارے پاس سیکڑوں مشہور و معروف اور قابلِ قدر و منزلت شاعروں ادیبوں کی لسٹ ہے جو اپنے دور کے بااثر ترین عوام دشمن بیوروکریٹ رہے تھے۔ آج صرف اُن کی شاعری اور تحریروں پر سر دُھنا جاتا ہے اور جبر و ظلم کی اُن کی کارستانیاں بھلا دی گئی ہیں۔ تاریخ! ہونہہ!۔

فہمیدہ نے بھی اِن فرعونوں کو کچھ نہ کہا۔ البتہ عمومی طور پر ''سول سرونٹ'' کے نام سے ایک نظم لکھ دی۔ ہم اُسی کو غنیمت جان کر یہاں نقل کرتے ہیں:

اپنی اپنی زندگی یہ لوگ پوری کر چلے
اور کسی نے ان سے یہ پوچھا نہیں کیوں کر جیے
اپنی اپنی پالکی میں سیرِ گلشن کو گئے
اور واپس آ گئے
گھر بنائے تین چار
اور تصرف میں رکھی دفتر کی کار

اس عمل میں ہوگیا ٹھنڈا مزاج
اس پہ اتنا کام کاج
سر پہ یہ کانٹوں کا تاج
تار و پودِ ہست و بود
سبز بھاجی کی طرح بنتا گیا سارا وجود
گھومتا ہے چند گز کے قطر میں کل راج پاٹ
افسری میں عمر بھر
مسکراتے مسکراتے ہو گئے چہرے سپاٹ

اس مجموعے میں آگے اُس کی فلسفیانہ نظموں کا ایک سلسلہ رواں ہوتا ہے۔ مشکل مشکل، قسط وار اور دیر فہم۔ طویل نظم ''زوجین' چھ الگ الگ نظموں کے باوجود گویا ایک ہی تسلسل ہے۔ ہمیں ایک ٹکڑا زیادہ پسند آیا، (یا زیادہ سمجھ آیا) وہ پیشِ خدمت ہے:

گنبد تو مگر بے در
جائے نہ صدا باہر
آتے ہو اِدھر ڈر کر
کیا یہ تھا تمہارا گھر؟

ہم اپنا یہ خوشگوار مشاہدہ پہلے ہی درج کر چکے ہیں کہ چھوٹی موٹی انسانی کمزوریوں سے قطع نظر، فہمیدہ کے عمومی فکر میں کہیں جھول و مصالحت نہ آئی۔ ''آدمی کی زندگی'' اُس کے 1988 سے لے کر سال 2000 پر مشتمل عرصے کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ''کوتوال بیٹھا ہے، نمبر 2'' نامی نظم بھی اسی مجموعے میں شامل ہے جو دراصل دس سال قبل 1981 تا 1987 والے مجموعے ''ہم رکاب'' میں کہی گئی نظم 'کوتوال بیٹھا ہے' کی دوبارہ تجدید ہے۔ وہ اب بھی اپنی نظم کے الفاظ و خیالات کے ساتھ سختی کے ساتھ چمٹی کھڑی ہے:

وقت آنے والا

احتساب ہم لیں گے
جب حساب ہم لیں گے
پھر جواب دینے کو
تم مگر کہاں ہو گے
خار و خس سے کم تر ہو
راستے کے کنکر ہو
جس نے راہ گھیری ہے
وہ تمہارا آقا ہے
ہم نے دل میں ٹھانی ہے
راہ صاف کر دیں گے
تم، کہ صرف نوکر ہو
تم کو معاف کر دیں گے

انسانی فلاح کا راستہ بھی عجیب راستہ ہے۔ اور اس راستے پر وفاداری اور استواری کے ساتھ چلتے رہنے میں انسانیت کی معراج پوشیدہ ہے۔ فہمیدہ نے یہ اشرف راستہ چڑھتی جوانی میں اختیار کیا تھا۔ اب جب وہ بوڑھی ہوگئی تو دیکھیے کس افتخار کے ساتھ وہ اپنی مستقل مزاجی کا تذکرہ کرتی ہے۔ نظم کا نام ہے، ''انقلابی عورت''۔ اُس کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

بڑھیا نے کب اس کی مانی
(حالانکہ اب وہ ہے نانی)
پھر اک نئی جنگ جوتنے چل نکلی وہ
(ظاہر ہے، اب اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی)
آسمان پر جھلمل تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے
رات کے پنچھی بول رہے تھے

اور کہتے تھے

یہ شاید اس کی عادت ہے

یا شاید اس کی فطرت ہے!

اِس مجموعے میں فہمیدہ کی ایک اور طویل وزینہ دار اور مشکل نظم ہے ''آدمی کی زندگی'' ۔ یہ سترہ نظموں پر مشتمل مسلسل نظم ہے ۔ زندگی کیا ہے، اس کی اصل حقیقت کیا ہے، انسان سے اس کا تعلق کیسا ہے ؟، کیا وہ خودمختار ہے ؟، کیا اِس کے وفا کرنے کے امکانات ہیں؟............فہمیدہ اچھا خاصا الجھا کر رکھ دیتی ہے۔ میں دو مصرعے بس نمونے کے بطور یہاں نقل کرتا ہوں:

زندگی سے آدمی کی دوستی ممکن نہیں

آدمی سے اس قدر، مختلف ہے زندگی

****

2011 میں اس کی نامکمل کلیات ''سب لعل و گہر'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔اس بے پرواہ شاعر کی بہت سی شاعری اِس میں شامل ہونے سے رہ گئی۔ یہاں وہاں بکھری جو تھی!۔

نثر نگاری

فہمیدہ ریاض، نثر بھی غضب کی لکھتی ہے۔ اُس کے لکھے ہر پیراگراف میں آپ کو عقل وشعور کے دو تین ایسے بڑے فقرے ضرور ملیں گے جن کی شان میں آپ اپنا جام اٹھا کر Cheers کرنے پہ مجبور ہوں گے:

''ساری نظریاتی بک بک، پُراسرار مشرق اوراس کے پُراسرار ہالے والی جڑی بوٹیاں اور تپسیا، پوجا پاٹھ، مراقبے، دو اسپرین کی گولیوں کے سامنے ہی منہ کے بل گر جاتے ہیں''۔............(کتنا اچھا فقرہ ہے۔ بالخصوص اُن لوگوں کے لیے جو ابھی سائنس کو اپنے فیوڈل وماقبل فیوڈل علاقوں میں متعارف ومقبول بنانے کی جدوجہد میں ہیں)۔

فہمیدہ کی تحریروں میں موجود wit کا منظرنامہ دیکھیے:

''فوراً مجھے اپنی امی یاد آئی تھیں۔ اپنی جانماز پر بیٹھی، کس طرح استقامت سے سر کی جنبش کے ساتھ کہتی تھیں، ''ایک دن آئے گا............ضرور آئے گا............جب خدا کے حضور میں جھکے گی تمہاری گردن............''۔

''امی!'' میں نے سر پکڑ کر کہا، ''خدا کے لیے اس وقت پریشان نہ کیجیے۔ میں کچھ سنجیدہ گفتگو کر رہی ہوں''۔

مگر اس حال میں بیٹھے بیٹھے میں نے گھبراہٹ کی سنسنی محسوس کی تھی۔ ''کہیں میں مذہبی تو نہیں ہونے والی ہوں؟ نہیں نہیں............ ہرگز نہیں!۔ یا اللہ پاک! میری دہریت کی حفاظت بس تیسرے ہی ہاتھ ہے''۔(1)

پھر اس کا ایک چھوٹا ٹکڑا پڑھیے، کردار نگاری تو دیکھیے:

''نواز شریف کہہ رہے ہیں......کچھ بھی نہیں کہہ رہے۔ حیران سی نظروں سے ہوا میں تک رہے ہیں......ہائیں؟ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ان سے تو ہم کہتے تھے کہ پنجاب میں دھماکہ نہ کرنا۔ ہم تو ہم خیال ہیں۔ اب افواج بتا رہی ہیں کہ یہ تو ملک کے ایک حصے پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں......تو پہلے کیوں نہ بتایا......اب ہم پر کوئی وحی تو آتی نہیں جو ہم کو پہلے سے معلوم ہو جاتا''۔

فہمیدہ بلا کی قوتِ مشاہدہ رکھتی ہے۔ ابھی حال میں وہ ہندوستان گھوم پھر کر واپس آئی تو فیس بک پر یہ خوبصورت مشاہدہ لکھا:

''......واپس اپنے دیس پہنچی۔ لاہور ائیرپورٹ پر سیکڑوں لوگ ہار پھول لیے کھڑے تھے۔ پاکستانی کبڈی ٹیم انڈیا سے میچ جیت کر آئی تھی۔ چہرے کھلے ہوئے تھے اور تکبیر کے نعرے گونج رہے تھے۔ کفر اور اسلام کے درمیان کبڈی ہوئی تو پہلے تو دونوں 'کوڈی کوڈی' کرتے اکھاڑے میں گھومتے رہے ہوں گے۔ پھر اسلام نے اس بار کفر کو ٹنگڑی لگا کر چاروں شانے چت کر دیا۔ اس بات کو مذاق مت سمجھیے گا۔ آپ سے کچھ نے اس میچ میں جیتنے کا حال اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ خوش قسمتی سے میں نے لاہور ایئرپورٹ پر اس ٹیم کا استقبال اپنی آنکھوں سے دیکھا''۔

فہمیدہ کی تحریریں ہمارے موجودہ فیوڈل معاشرے پر 'ارورا' کا توپ ہیں۔ ریاست ضیا الحق تھی تو اس کی کتابیں سٹالوں پر آتی ہی نہ تھیں کہ ان بدبختوں کے کمزور ایمان کا تخلیق کردہ نظریۂ پاکستان ہمہ وقت خطرے میں رہتا ہے۔ اب ضیا الحق نہیں ہے تب بھی ہر شخص ضیا کے گیارہ سالوں کی سڑاند کو آکسیجن کے متبادل کے بطور درآمد کر کر کے اپنے عقل وخرد کے پھیپھڑوں کو مفلوج بنوا چکا

ہے۔سارا ملک، ضیاالحق۔

فہمیدہ ریاض نے خاکہ نگاری بہت کم کی مگر جب لکھی تو خوب لکھی۔ چھپے ہوئے بارہ صفحے کے قراۃ العین حیدر پر لکھے گئے اُس کے مضمون کے حُسن و ہارمنی کے سامنے میں اپنے بہت سے دوستوں کی بدہیئت محبوباؤں کی قربانی دینے کو تیار ہوں۔

کیا مشاہدے ہیں، کیا مطالعے ہیں اور کیا خوبصورت و برحق تصویر کشی ہے!!۔

حوالہ جات

1- شیشۂ دِل۔ کتابی سلسلہ 'آج' کراچی نمبر 39۔ صفحہ 95

کہانیاں

فہمیدہ کے افسانے بہت بے مثال رہے ہیں۔ اس کے دس افسانوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی کتاب ''خطِ مرموز'' کے نام سے 2002 میں چھپ گئی۔ باقی افسانے اس کی دیگر نثری اور شعری تخلیقات کی طرح مختلف رسالوں میں یہاں وہاں بکھرے پڑے ہیں۔ جن میں سے کچھ کو حاصل کرنے کے لیے میرے ایک شناسا اور فہمیدہ کے ایک پرستار کو روپیہ سترہ سو خرچ کرنے پڑے۔ نیز کتب خانے کے مالک کو دیر تک بحث میں مبتلا رکھ کر اُس کے ملازم کو وہ تمام رسالے ڈھونڈنے میں لگانا پڑا، جن میں فہمیدہ کی کوئی چیز چھپی ہو۔

اس کے کچھ افسانے میری سمجھ میں آ گئے۔ اور کچھ کو میں بالکل سمجھ نہ سکا۔ مثلاً اس کی کہانی ''رات'' میرے سر کے اوپر سے گزری۔ مجھے یاد ہے کہ وہ افسانہ پڑھ کر اُس کے نیچے میں نے لکھا تھا: ''سمجھ میں نہیں آیا''۔

''ایک محبت کی کہانی'' وادیِ کوئٹہ کا بیانیہ ہے۔ لڑکی کراچی کی ہے، اور اس کا محبوب اٹک پار کا پٹھان۔ شادی ہو نہ پائی مگر شادی شدہ قاری کو چھوارے کے بطور کئی اچھے فقرے، باتیں اور

مناظر مل جاتے ہیں۔

اس کے افسانے ’’بوڑھے اور لڑکا‘‘ کے نیچے بھی میں نے ’’بلوچ ماما کچھ نہ سمجھا‘‘ لکھ دیا۔

فہمیدہ نے اپنے افسانے ’’عورت اور چیتا‘‘ میں بچے کی پیدائش کے وقت ماں کی تکلیف اور ہوش و بے ہوشی کی سرحد میں بکھرے درد کو بہت افسانوی خوبصورتی سے بیان کیا۔

’’اس نے کہا تھا‘‘ نامی افسانہ بہاولپور کی ایک بلوچ عورت کے بارے میں ہے۔اس افسانے میں وہ عورت کے مصمم ارادے، اُس کی ان تھک محنت اور کامیابی کو موضوع بنا کر عورت کے حقوق کی تحریک کے لیے ایک خوبصورت منشور لکھ ڈالتی ہے۔

’’پرسنل اکاؤنٹ‘‘ میں فہمیدہ نے انگلستان میں ایشیائی عورتوں کی حالتِ زار کے بارے میں لکھا۔اِس میں اُس نے اُن کے ایشیائی خاوندوں کی قدامت پرستی اور سفاکی کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔یہی موضوع اس کے ایک اور افسانے ’’کلیپ ہیم ساؤتھ‘‘ کا بھی ہے۔

’’وہ چلی گئی‘‘ نامی افسانہ بھی عورت کی نجات کے بارے میں ہے۔

’’تاریخ کے مینار‘‘، بابر نامہ سے ماخوذ ایک کہانی سی چیز ہے جو اِس بندۂ حقیر و پُر تقصیر کی سمجھ میں بالکل بھی نہیں آئی۔

البتہ ’’کیا گلابی کبوتر جیت گئے؟‘‘ ایک بہت ہی پُر معنی اور گہری کہانی ہے۔جس میں وہ بے شمار کہانیاں ڈال دیتی ہے۔اپنی سیاسی ادبی زندگی کے کچھ ٹکڑے، پاکستان میں ضیا الحق کی آمد، بھٹو کی پھانسی، سوویت یونین کی تحلیل اور وسط ایشیا کے ممالک کی آزادی کے تذکروں میں کس کی ہار اور کس کی جیت کا مقدمہ پیش کرتی ہے............ اور بہت حقیقت پسندی سے پیش کرتی ہے۔اس افسانے کی دو چار لائنیں پڑھیے:

’’قزاقستان اب دیو مالائی، پریوں کا دیس نہ تھا بلکہ ایک نو آزاد
ریاست۔مسلمان؟۔ہاں مسلمان بھی۔(کیا اب یہاں تحریکِ
ختمِ نبوت کا آغاز ہوگا؟۔کیا سپاہِ صحابہ یہاں آنے والی ہے؟۔
ہاں......وہ جہاز بھر بھر کر آ رہے ہیں......)۔‘‘

افسانہ ’’حاصل‘‘ میں وہ اپنی پہلی شادی کے ٹوٹ جانے کے نتیجے میں پچھلے شوہر سے اپنی بیٹی سارہ پر اُس کے پڑنے والے اثرات کا اجمالی جائزہ لیتی ہے جو ماں کی دوسری شادی پر شاکی ہے۔کشمکش کی پگڈنڈی کا سفر ہے یہ افسانہ!!

’’خطِ مرموز‘‘ نامی افسانے میں جو چاشنی ساٹھ برس والے قاری کے لیے تھی، اُسے میں یہاں بیان کر کے پھُس پھُسا کرنا نہیں چاہتا۔خود پڑھیے نا!۔پانچ ورق کے اس افسانے میں پہلے دو ورق ہی ذرا تمہیدی بوریت دکھاتے ہیں۔بعد میں تو ایسی روانی ہے کہ پوپ بینیڈکس کے منہ میں بھی پانی آ جائے۔اور اس کے چرچ کے پادری کمسن بچوں سے ریپ کا گھناؤنا فعل بند کر دیں!!

فہمیدہ کا ایک طویل افسانہ ’’جھنو کو چھٹی ملی‘‘ ایسی اردو میں لکھا ہوا ہے جسے انسان نہیں سمجھیں گے۔یہ کوئی جنّوں والی اردو ہے۔اُسے پڑھے گا بھی وہی جو فہمیدہ ریاض کو جانتا ہو گر نہ اتنی مشکل اردو تو ہندوستان کے اُسی علاقے کی ہوگی جہاں جھنّو رہتی ہوگی۔ایسی مشکل زبان میں اتنا طویل افسانہ۔فہمیدہ کو مجھ جیسے قاری کو تکلیف میں رکھ کر بڑا چین ملتا ہوگا۔یہ افسانہ بھی عورت پہ ہے اور عورت کہاں اچھی حالت میں رہی۔گاؤں کے لوگ ہیں، مولبی (مولوی صاحب) ہے، جھنو کی جوانی ہے، فرقہ واریت ہے اور بد نصیبی ہے۔

’’فعل متعدی‘‘ اُس زمانے کا افسانہ ہے جب فہمیدہ اردو ڈکشنری بورڈ کی انچارج بنی۔پاکستان میں قومی زبانوں کا مسئلہ، اردو کا مقام، اردو لسانیات کے معاملات، بیوروکریسی اور اس کی نزاکتیں سازشیں، اردو ڈکشنری بورڈ کی تاریخ............ ایک پوری دنیا کو فہمیدہ نے ایک افسانہ میں سمو دیا ہے۔

’’دسترس‘‘ نامہ افسانہ انتہائی فلسفیانہ اور عالمانہ ہوتے ہوئے بھی بہت ہی شگفتہ افسانہ ہے۔

’’ڈھولی تارو ڈھول باجے‘‘ نامی کہانی سندھ کے سکرات میں پڑے جاگیرداری نظام سے متعلق ہے، جہاں آمدنی ہو نہ ہو کروفر اپنا انتظام خود کروا لیتا ہے۔فیوڈل اگر شان و شوکت نہ بھی کرنا چاہے تو فیوڈل ادارتی نظام اُس سے ایسا کرواتا ہے۔مقروض فیوڈل اپنی زمینیں، مویشی، حتیٰ کہ اگلی دو تین فصلیں بھی پیشگی گروی رکھ کر کروفر کی شادی وغیرہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

فہمیدہ ریاض نے ایک اور بہت اچھی کہانی لکھی: ’’ایک مقتول صدر کے بیٹے‘‘۔ یہ دراصل دو معمر شدہ بھائیوں کا قصہ ہے جن میں سے ایک پھولوں کا کاروبار کیا کرتا تھا، دوسرا ٹریول ایجنسی کا مالک۔ اِن کا باپ پاکستان کا اولین صدر لیاقت علی خان تھا جو سرحد پار سے بھاگ کر یہاں آیا تھا اور پھر مُلّہ دکھا کر یہاں صدر بن بیٹھا تھا جسے پھر راولپنڈی میں قتل کر دیا گیا تھا۔ فہمیدہ اپنے انداز میں افسانہ جاری رکھ کر اصل میں یہ معلومات دینا چاہتی ہے کہ اس کے قتل کی وجہ ’’......سنا ہے مقتول صدر کابینہ میں تبدیلی کرنے والے تھے‘‘۔

اسی افسانے میں فہمیدہ نے فیض احمد فیضؔ کا نہایت خوبصورت تذکرہ کیا ہے:

’’......اولین صدر کے زمانے میں اُسے ایک فوجی انقلاب لانے کی سازش میں شریک ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اسے دوسرے ادیبوں اور صحافیوں کے ساتھ کئی برس جیل میں رکھا گیا تھا اور ایک جیل سے دوسرے دوسرے جیل منتقل کیا جاتا رہا تھا۔ مگر یہ شاعر اس درجہ خلاّق تھا کہ قید خانے کی سختیاں جھیلتے جھیلتے اس نے جو شاعری کی وہ بے حد حسین و جمیل، غم زدہ اور ساتھ ہی عوام کے لیے بہتر دنوں کی امید سے روشن اور تابناک قسم کی نکلی جو وہ اپنے ملاقاتیوں کے ہاتھ باہر بھیجتا رہا اور یہ لکیروں کے اندر اور باہر ہزاروں لوگوں کے دل میں اتر گئی۔ جب وہ جیل سے باہر نکلا تو ہزاروں لوگوں کا ہیرو اور محبوب تھا۔ لوگوں کی محبت بہر حال اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا پیٹ نہ بھر سکتی تھی اس لیے وہ روزگار کے لیے سرگرداں ہی رہا۔ ملک کے حاکموں کو الگ اُسے جیل بھیجنے کی عادت سی پڑ گئی تھی اور جب بھی ملک کی حاکمیت میں تبدیلی آتی تو اسے جیل بھیج دیا جاتا۔

’’دوسری صورت میں، کیوں کہ اس کی عوامی مقبولیت اور والہانہ محبت روز افزوں رہتی تھی، حکام اُسے مجبور کرتے کہ وہ اُن سے مل جائے اور بس اُن کا ہو کر رہے۔ اس پر ستم رسیدہ اور غم زدہ شاعر لکیریں پار کر کے کسی دوسرے ملک جا بستا جہاں سے پھر وہ کسی اور ملک کا رخ کرتا اور پھر کہیں اور چلا جاتا۔ جب وہ ملک واپس آتا تو وہی پرانے مسائل از سرِ نو اس کو کچوکے لگاتے۔ جب وہ لکیروں سے کہیں بہت دور نئی لکیروں میں ہوتا تب بھی اس کا دل خون خرابے اور ظلم و ستم پر درد سے بے چین رہتا اور وہ شعر لکھ لکھ کر وطن بھیجتا رہتا، جسے اس کے شائقین چومتے اور آنکھوں سے لگاتے

اور آنسو بہاتے۔ بالآخر ایک بار شکستہ بدن اور زخمی روح کے ساتھ جب وہ اس ملک میں واپس آیا تو جلد ہی دل کا دورہ پڑنے سے ختم ہو گیا۔‘‘

ناول

فہمیدہ کے ناول (ناولٹ کا لفظ اُس کی تحریروں کی شان میں گستاخی متصور ہوگی) بھی بہت قابلِ ذکر ہیں۔ ریڈیبل بھی ہیں، مگر پیچیدہ بھی۔ اُس کی ناول نگاری میں کوئی سیزیرین، کوئی فورسپس استعمال نہیں ہوتے۔ قدرتی بہاؤ میں فطری انداز میں بچے کی ولادت ہوتی ہے۔ انفارمل اسلوب۔ (اب تو اُس کی نظموں میں بھی مجھے یہ بات محسوس ہونے لگی ہے)۔ وہ اپنے زبردست قوت مشاہدہ کو بروئے کار لاتی ہے، اور اُسے اپنے تصورات اپنے تخیل کا جامہ پہناتی ہے۔

گوداوری:

1995 میں شائع کردہ ناول ''گوداوری'' شوسینا، بال ٹھاکرے، بمبئی، مراٹھا، فرقہ واریت، عورتوں کی حالت اور کمیونزم کے موضوع پر لکھا ہوا ناول ہے۔ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل اس ناول کی زبان بہت نا آشنا، مگر بہت بے باک ہے، مروج سے ہزار گنا زیادہ بے باک، بے باک

ترین سے بھی بے باک۔

ناول کی شروعات جتنی غیر روایتی ہے، اُس کا سارا بہاؤ، اس کا کلائمیکس اتنے ہی غیر روایتی ہیں۔ اس بہت ہی غیر مانوس زبان میں اور بالکل ہی نا آشنا علاقے پر لکھے ہوئے ناول کو بہت جبر کر کے پڑھا جا سکتا ہے۔ میں نے بھی خود پہ چلتن پہاڑ جتنا بوجھ ڈال کر اسے پڑھا۔ لگتا ہے اُس پر تنقید کرنے (مشورے دینے) والا کوئی نہیں ہے۔ مگر قاری کو پڑھنے میں تکلیف دے کر خواہ وہ جتنی بھی گناہ گار ہوگئی ہو، اس ناول میں روشن خیال فہمیدہ آپ کو جگہ جگہ چونکا دے گی۔

ذرا دیکھیے:

''جہاں کمیونسٹ حکومتیں ہیں وہاں کبھی سنا بلوا فساد ہوتا؟۔ کیرالا ہے، بنگال ہے، وہاں کبھی سنا؟''(صفحہ 121)

''اُدھڑائی عورت بے چاری! جب کششِ ثقل اور پیدائش بچگان کی مشترکہ بے ہودہ سازش سے بدن ڈھل رہا ہو، تب وہ روح کی برتری نہ چاہے گی تو کیا بدن کی برتری چاہے گی؟''۔ (صفحہ 48)

بال ٹھاکرے کی انتہا پسندی میں سرشار نوجوانوں کو بدقسمت نعرے لگاتے دیکھ کر وہ کہتی ہے:

''فرقہ واریت کے سدا روشن الاؤ کے انسانی ایندھن............''(صفحہ 89)

''تہذیب کے رحم کی کلبلاہٹ سے گنتر لیش جی کو جنم تو لینا تھا۔''(صفحہ 99)

''اس طرح عورتیں، دراصل، کسی جنسی کج روی کے رجحان کو دبا کر، اس کے نعم البدل کے طور پر انٹی لیکچوئل بن گئی ہیں۔''(صفحہ 115)

''فرقہ پرست لوگ سیکولر آدمی کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں''۔(صفحہ 121)

''کون کرواتا ہے بھئی یہ فساد؟ یہ پراپرٹی ڈویلپرز............کنسٹرکشن کمپنیوں والے۔ جانتی ہو کیوں؟۔ یہ جھونپڑیاں جو ہیں نا، انہیں خالی کرانے کے لیے، ان پر کئی منزلہ عمارتیں بنانے کے لیے، غریب مراٹھوں کو پیسے دے دلا کر، ٹھرّا پلا کر، کرواتے ہیں خون خرابا۔ سرکاری افسروں کو،

سیاسی لیڈروں کو، سب کو پیسہ کھلاتے ہیں اور سب کھاتے ہیں پیسہ............" (صفحہ 124)

اسی ناول میں یو پی والوں سے متعلق ایک فقرہ پڑھ کر تو مجھے سائیں کمال خان یاد آیا جو ملا فضل الرحمٰن کی پارٹی کے ایک بڑے لیڈر کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتا تھا: "............ چوں کہ، چنانچہ، گویا کہ، حالاں کہ، پس تو ثابت ہوا............" (صفحہ 148)

زندہ بہار:

"زندہ بہار" میں بنگلہ دیش ہے۔ اس سفر نامہ نما تصنیف میں ہلکا پھلکا مزاح، دلچسپ چھوٹے چھوٹے فقرے مگر بلا کا ابلاغ ہے۔

کراچی:

"کراچی" نامی ناول/ناولٹ کی کہانی تو لگتا ہے بہت لمبی ہو چکی ہے۔ اب فہمیدہ کو چاہیے کہ دوبارہ اُس ناولٹ کو دیکھے اور اُسے مکمل ناول کی شکل دینی چاہیے۔ تشدد، ہی تشدد، موت ہی موت اِس شہر کا مقدر بن گئے ہیں۔ فہمیدہ نے تو بس جھلک دیکھی تھی اُس وقت۔ اس ناول میں اس نے کراچی کا درد بیان کیا ہے ۔اور بڑے آرٹسٹک انداز میں ایسا کیا ہے۔

****

چوتھی صدی میں دجلہ کے مشرقی کنارے پہ مزدک کا انقلاب وقوع پذیر ہوا تھا............

اُس پر وہ کام کر رہی ہے۔ وہ اس کا ایک چھوٹا سا حصہ کسی رسالے میں چھاپ چکی ہے۔ باقی کے لیے مطالعہ اور تحقیق میں، "آپ کی آپا نے تقریباً اپنی آنکھیں کھو دی ہیں"۔

تراجم

شیخ ایاز:

فہمیدہ نے کتنے ہی تراجم نے کر رکھے ہیں۔ اس نے بہت زمانہ پہلے، شاہ لطیف کے پائیں میں دفن شیخ ایاز کی شاعری کو اردو میں ڈھالا۔ سچی بات ہے شیخ ایاز کا نام تو لوگوں نے سن رکھا تھا مگر اُس کا کلام ایک پوری نسل نے فہمیدہ کے ترجمے کی برکت سے پڑھا۔

شاہ لطیف:

مگر کیا معلوم اصل ہدف تو مرشد خود تھا۔ ذرا تصور کیجیے۔ شاہ لطیف نہ ہوتا تو 'فکرِ نوائے وقت، لاہور' سندھ کے ساتھ کیا حشر کرتی۔

مجھے اب جا کر پتہ چلا کہ فہمیدہ، شاہ کی فکری داسی کیوں ہے۔ دراصل سندھی زبان و ثقافت کو فہمیدہ نے بہت قربت سے چاہا ہے۔ پس منظر یہ ہے کہ اُس کے میرٹھ والے باہم کزن والدین 1930 کے زمانے میں سندھ میں آ کے بس گئے تھے۔ جس وقت حیدر آباد سندھ میں نور محمد سکول کو ہائی سکول بنا دیا گیا تو نور محمد نے علی گڑھ یونیورسٹی سے کچھ اساتذہ مہیا کرنے کی درخواست کی

تھی ۔اُن اساتذہ میں میرٹھ کا ریاض الدین احمد بھی شامل تھا، فہمیدہ کا والد۔ ریاض الدین سندھی پڑھاتا تھا اور سندھی میں شاعری کرتا تھا۔

رابعہ خضداری:

اس نے ہماری رابعہ خضداری کا خوبصورت کلام بھی اردو میں ڈھالا۔

فرخ زاد:

فارسی کی جواں مرگ شاعرہ فروغ فرخ زاد کی منتخب نظموں کا ترجمہ کیا: ’’کھلے دریچے سے ‘‘ کے عنوان سے ۔اور لوگوں کے اچھے برے تراجم کا تو معلوم نہیں لیکن یہ پتہ ہے کہ پاکستان میں اِس ایرانی شاعرہ کو متعارف ہی فہمیدہ کے ان تراجم نے کیا تھا۔

مولوی:

عجیب وغریب روح ہے، فہمیدہ۔ ترجمے کے لیے اُس کا انتخاب بہت عمدہ ہوتا ہے ۔وہ غرق ہوتی ہے شاہ لطیف میں، اور اس کے بعد مستغرق ہوتی ہے مولانا روم میں ۔ ہاں یاد آیا جب وہ مولانا کی غزلوں کا اردو ترجمہ کررہی تھی تو وہ اس کی ایک ایک غزل کو ترنم سے پڑھتی جاتی اور اسی بحر و ترنم میں اُس غزل کا اردو ترجمہ کرتی ۔کاش وہ دن لوٹ آئیں ۔عبداللہ جان کا سریاب والا گھر، سنڈے پارٹی کی محفل ۔مولانا روم کی باشعور و باتمیز و باجمال و باکمال شاعری، حسین و باوقار ترجمہ کی ماہر فہمیدہ، اور اُس خوب رو، خوب خو، فہمیدہ کی خوش گلوئی...........انسان کیف وفہم کے ساتویں آسمان پر ۔مگر یہ کوئی پندرہ سال پرانی بات ہے۔

رومی کی پچاس غزلیں ’’یہ خانۂ آب وِ گل‘‘ نامی کتاب کا روپ دھار گئیں۔

شاہ اور رومی کا ترجمہ کیا کر گئی ایک نئی جنجال کھڑی کر گئی۔ خود کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی۔ وہ اب پاکستانی اپر، اور اپر مڈل کلاس کی ابھاری ہوئی نئی نظریائی کنفیوژن کا بھرپور شکار ہوئی ہے ۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ اوپری طبقات خود کبھی بھی مذہبی نہیں ہوتے ۔ انتہا پسند اور بنیاد پر

ست تو بالکل بھی نہیں ۔اس لیے ضیا الحق کے بنائے گئے بنیاد پرست ملک میں ایک ایسے مسلک کی سخت تلاش شروع ہوئی جس میں عام آدمی کی تساہل، بے عملی، تقدیر پرستی اور غیر منظمی یقینی بن جائے ۔ چنانچہ انہوں نے ’’صوفی ازم‘‘ کا امرت دھارا تلاش کر لیا۔ خود کو کوسنا، خود ملامتی کرنا، ناچ ناچ کے اگلے کو رجھانا منانا...........الغرض شاہ عنایت جیسے جنگیالی انسان کو بڑی اُستادی سے جدوجہد کے میدان کے اساتذہ کی صف سے نکال کر ایسے سارے شاعروں دانشوروں کے غول میں ڈال دیا گیا، جنہیں ’صوفی‘ کا اجتماعی نام دیا گیا اور پھر انہیں ہتھیار بنا کر عوامی تحریکوں کے خلاف استعمال ہونے والے بے شمار ہتھیاروں کے اسلحہ خانے میں شامل کیا گیا ۔مقصد تو عوام الناس کو ماضی کی طرف لے جانا تھا۔اُن کا بس چلتا تو مذہب میں کوئی فرقہ بنا ڈالتے ۔مگر مذہب پر تو پہلے ہی رجسٹرڈ کمپنیوں کا قبضہ تھا۔ ولیوں بزرگوں کو رنگ برنگی پگڑیاں، سرمے اور عطریات والے لے گئے ۔ لے دے کر یہی اچھے دانش ور اور اپنے عہد کے رومانٹک یوٹوپیائی انقلابی رہ گئے تھے جواب تک برا نڈڈ نہ تھے ۔لہٰذا وہ ’صوفیوں‘ کی عمومی چوکھاٹ میں بھرتی کر کے اور چابک بنا کے عوامی اجتماعی شعور کی پیٹھ پر برسانے لگے۔

ہماری فہمیدہ گو کہ اپنے حوالوں اور اپنے تجربوں مطالعوں سے ’صوفیوں‘ تک پہنچی ۔مگر تقویت تو بہر حال پیر وسجادہ نشین و ماضی پرستی کو ہوئی ۔اچھے بھلے انقلابیوں کو صوفی بنانا کہاں کی دانش وری ہے۔ اور اگر یہ داؤ پیچ کا معاملہ بھی ہوتا تب بھی یہ غلط ہوتا۔ اب ہم اپنی اِس دوست کو کیا بتائیں کہ محض دو ترجموں سے بالائی طبقہ اپنا ہتھیار آپ کے حوالے نہیں کرے گا۔ اور اگر آپ کے حوالے ہو بھی جائیں تو یہ آپ کی حکمت عملی اور داؤ پیچ کے کس کام کے؟۔

فہمیدہ تو فہمیدہ ہے۔ وہ جب یہ تراجم کر رہی تھی تو سارے پاکستان کے اہلِ علم وقلم کو ڈھنڈورا کر کر کے بتا رہی تھی کہ وہ رومی کا ترجمہ کر رہی ہے۔ اور یہی فہمیدہ کا وطیرہ ہے۔ وہ جو چیز لکھ، پڑھ، سوچ، یا کر رہی ہوتی ہے وہی پھر پورے شہر کی بحث کا موضوع ہو جاتی ہے۔ مولانا کے کلام کے ترجمے میں ایسا انہماک، ایسا انجذاب کہ کئی بار خطرہ پیدا ہوا کہ فہمیدہ، فہم ہی کھو نہ بیٹھے۔ اس سارے عرصے میں اس پہ نیم دیوانگی کا عالم طاری رہا۔ (فہمیدہ اپنی راہ پہ ہی آئے گی۔ وہ کچھ بھی ہو سکتی ہے، تو اہم پرست بالکل نہیں)۔

یہ اعتراض تو میرا رہے گا کہ وہ ''صوفی'' کی اصطلاح مانتی ہے، استعمال کرتی ہے۔اور پھر خدا معلوم کیوں ''صوفی ازم'' اور ''مارکسزم'' کو ایک جیسا سمجھتی ہے۔وہ ''یوٹو پیائی کیمونزم'' سے نابلد تو بالکل نہیں ہے!۔ پھر کیوں وہ صوفیوں کو سوشلسٹ بنانے کے حق میں نہیں ہے۔وہ انہیں سیکولر بھی کہتی ہے، انسان دوست بھی۔

اس نے رائز ماریا رلکے، کی دس صفحے طوالت رکھنے والی نظم کا خوبصورت ترجمہ ''اورفیئس کے لیے نغمہ'' کے عنوان سے کیا۔

اس کے علاوہ اس نے خوبصورت عالمی افسانوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔اُن میں سے یمن کے میفع عبدالرحمٰن کی کہانی What Came Between Aneesa and Me قابلِ ذکر ہے۔

فہمیدہ نجیب محفوظ کے ناول کا ترجمہ ''شادیانے'' کے نام سے کر چکی ہے۔

اس کے علاوہ فہمیدہ ریاض نے عورتوں کے حقوق پر مشتمل مارگریٹ ایٹ وُڈ کے ناول The Edible woman کا ترجمہ ''عورت جسے کھایا جا سکتا ہے'' کے عنوان سے کیا۔ یہ اتنا پیچیدہ ناول ہے کہ اگر فہمیدہ اپنے تین صفحے کا ''پسِ نوشت'' نہ لکھتی تو کم از کم میں تو اس کو نہ سمجھ پاتا۔

سفرنامے

فہمیدہ ریاض نے مختصر سے سفرنامے بھی لکھے ہیں۔امریکہ کے سفر پہ لکھے ایک مضمون کے یہ ٹکڑے دیکھیے:

* ''چھوٹے چھوٹے، معمولی سے مکانات، ہرے بھرے درخت جو بہت گھنے نہیں تھے۔فٹ پاتھوں پر چلتے معمولی مرد، عورتیں، بچے۔ میں انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ امریکی ہیں۔صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان میں سے کسی کو ذرہ بھر بھی یہ احساس نہیں کہ یہ دنیا کی واحد سپر پاور کے شہری ہیں (ورنہ انہیں اکڑ، اکڑ کر چلنا چاہیے تھا)''۔

* ''سامنے ایک لیموزین حماقت کی تصویر بنی آ کھڑی ہوئی۔لمبی، جتنی انسان کی انا ہو سکتی ہے، اتنی لمبی کار بنا ڈالی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔اندر تو وہی دو آگے اور تین پیچھے نشستیں تھیں۔ کچھ میزیں وغیرہ بھی تھیں۔جن پر مشروبات اور کھانے پینے کی چیزیں رکھی جا سکتی تھیں۔باقی کی لمبائی میں بس، ہوا بھری تھی۔''(1)

''شیشۂ دل'' کے عنوان سے اُس کا ایک طویل مضمون، ناروے کے سفر کے بارے میں چھپا۔ایسا مزیدار، ایسا پُر لطف کہ پڑھ کر مزہ آ جائے۔کہیں کہیں مزاح کے خوبصورت جملے دے مارتی

ہے۔چکھیے ایک دانہ چاول کا،اور مزہ لیجیے پوری دیگ کا:

’’وائی کنگ کا ہی زمانہ تھا جب کہ ایک بادشاہ اولافؔ قرب و جوار کے لوگوں کو عیسائی بنانے میں جٹا تھا۔وائی کنگ سردار،گڈؔ برانڈ کو خبر ہوئی کہ شاہ اولاف اس کے علاقے میں آنے والا ہے تو اس نے رعد و برق کے دیوتا ’تھور‘ کے مندر میں ایک جلسہ منعقد کیا اور کہا،’’عیسائی ہمارے بتوں کو توڑ رہے ہیں۔کیوں نہ ہم انہیں ’تھور‘ کے مندر میں ملنے کی دعوت دیں۔تھور کے غضب سے یہ بدبخت عیسائی موم کی طرح پگھل کر بہہ جائیں گے‘‘۔ الغرض یہ ملاقات ہوئی۔شاہ اولافؔ نے کہا:’’اے نارمنو!بت پرستی چھوڑ دو............‘‘۔گڈؔ برانڈ نے کہا:’’ہمارا خدا سب سے طاقت ور ہے۔اس نے ہمیشہ ہماری مدد کی ہے۔تم ایسے خدا پر یقین کرتے ہو جسے دیکھ بھی نہیں سکتے‘‘۔شاہ اولافؔ نے کہا،’’کیوں نہیں دیکھ سکتے؟ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو............ وہ رہا ہمارا خدا............‘‘ وائی کنگ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔شاہ اولاف نے گھما کر جو دیا تلوار کا ایک ہاتھ تو تھور دیوتا کی مورتی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔پھر اس نے کہا:’’ دیکھا!تمہارا خدا تو اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکا۔وہ تمہیں کیا بچائے گا۔بس اب اصلی خدا پر ایمان لے آؤ‘‘۔پس وائی کنگ ایمان لے آئے‘‘۔(2)

ایک اور مزیدار پیراگراف ملاحظہ ہو:

’’نوال السعوادی حال ہی میں مصر سے ایک ہولناک مقدمہ لڑنے کے بعد واپس آئی تھیں۔وہاں چند لوگوں نے اُن کی مبینہ طور پر اسلام مخالف تحریروں کے باعث انہیں دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے کر ان کا نکاح فسخ ہونے کا دعویٰ دائر کیا۔(یہ نہ سمجھیے گا کہ صرف پاکستانی ملّاؤں کو عورتوں کے نکاح فسخ کروانے کا شوق ہے؛ان کے بھائی بند مصر میں،شاید ہر مسلم ملک میں موجود ہیں)‘‘۔(3)

حوالہ جات

1- ریاض،فہمیدہ۔شیشۂ دل۔کتابی سلسلہ’آج‘کراچی،نمبر39۔صفحہ 93

2- ریاض،فہمیدہ۔شیشۂ دل۔کتابی سلسلہ’آج‘کراچی،نمبر39۔صفحہ 75

3- ریاض،فہمیدہ۔شیشۂ دل۔کتابی سلسلہ’آج‘کراچی،نمبر39۔صفحہ 89

پبلشنگ، سیمینار یں

ہم درمیان میں ایک دوسرے سے گم ہو گئے ۔زمانے کی ٹریفک ہمیں اپنے ساتھ ہماری اپنی راہوں پہ بھگاتی دوڑاتی رہی۔کہیں جا کر 2004 کو ہماری ملاقات ہوئی۔ وہ ’’وعدہ‘‘ نامی ایک تنظیم بنا کر ملک بھر میں ادب کے موضوع پر یا پھر معاشرے میں عورت کی حیثیت کی بہتری کے لیے کام کر رہی تھی۔سیمینار یں کراتی تھی، کتابیں چھاپتی تھی۔

فہمیدہ کو بلوچستان میں بھی یہ سیمینار کرنا تھا۔اُس نے فون کھڑکایا،خواتین پر ایک سیمینار منعقد کرنے کی خواہش کی ۔سنگت اکیڈمی کے نظریے اور فکر میں چونکہ یہ بہت ہی دلچسپی کا شعبہ تھا لہٰذا ہم نے اپنی بڑی’سالانہ کانفرنس‘ کا موضوع ’’بلوچستان کا ادب اور خواتین‘‘ بنانے کا فیصلہ کیا۔

یہیں کہیں اُسے مجھ میں ایک چھوٹے خادم کے بجائے ایک ’’چھوٹا بھائی‘‘ نظر آیا۔میٹھی آواز میں ’’ہیلو چھوٹے بھائی شاہ محمد‘‘ شاید میرے لیے سب سے مترنم آواز بن گئی۔(اب حال ہی میں اس نے میری ترقی کر دی اور ’’چھوٹا دوست‘‘ کہنے لگی ہے۔حتیٰ کہ پچھلے ای میل میں مجھے Dearest کا خطاب بھی دے بیٹھی۔’تکیہ کلام‘ کتنا فریب دہ، کتنا سراب ہوتا ہے!!)۔

اس سیمینار کی افتتاحی تقریب میں فہمیدہ نے جو کچھ کہا؛ وہ عورتوں اور بلوچستان سے متعلق بہت فکر انگیز تھا۔اس نے اپنی اس تقریر کو’’گوہر کی اونٹنیاں‘‘ کا عنوان دیا۔

’’ہمارا ماضی ایک معمہ ہے، وقت کے فاصلے کے دھندلکے میں گم............جو ہلکا سا عکس نظر آ سکتا ہے اس پر بھی کئی تہیں چڑھائی جا چکی ہیں۔مغرب سے آنے والے اجنبیوں میں سے بعض مستشرقین نے بے شک اس آئینے سے گرد صاف کرنے کی کوشش کی ۔وہ فرنگی تھے لیکن اس سے بڑھ کر محقق تھے اور عالم تھے۔ایسے لوگ رومی اور ابنِ خلدون کی طرح کل عالم انسانیت کا سرمایہ ہوتے ہیں۔وہ ہمارے پیارے ہیں اور ہم انہیں سلام کرتے ہیں ۔لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایک ’سرکاری‘ مغرور رویہ بھی تھا جو عام کیا گیا اور اس لیے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔اور وہ یہ کہ ہم جاہلوں اور وحشیوں کی ایک قوم ہیں، باہر سے آنے والے حکمران ہمیں مہذب بنانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

’’اس تاریک تصویر پر مزید تاریک تہہ اُس نئی آئیڈیالوجی نے چڑھائی ہے جو مذہب کے مقدس نام کو استعمال کر کے پاکستان کی پوری آبادی پر تھوپی جا رہی ہے۔ان نام نہاد علم برداروں کا کہنا ہے کہ یقیناً ہم قاتلوں اور وحشیوں کی قوم ہیں لیکن ہم اس پر فخر کرتے ہیں۔ہم ہمیشہ سے اس سے بھی بدتر رہے ہیں اور ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے کیونکہ یہ ہمارا مذہب ہے۔

’’اس تاریکی میں ہم کہاں جائیں، کہاں راستہ تلاش کریں؟۔کیا ہم سب، وہ لوگ جو اس خطے میں رہتے ہیں جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔ بلوچ سندھی، پنجابی، پختون اور ہندوستان سے آنے والے ایک کروڑ سے زیادہ باشندے، کیا ہماری تاریخ بربریت کی ایک وحشت ناک داستان کے سوا اور کچھ بھی نہیں؟ ۔کیا ہم انسانی حقوق کے الفاظ سے بھی ناآشنا رہے ہیں؟ ۔کیا ہمارے تہذیب سے عاری معاشرے میں عورت بھیڑ بکری سے بھی بدتر رہی ہے؟۔کیوں کہ بھیڑ تو کبھی کبھی ممیاتی بھی ہے لیکن عورت کو تو اس کی بھی اجازت نہیں۔کیا اس کرّہ ارض پر، ہزاروں برس سے انسان نے جو تہذیب وتمدن کی داستان رقم کی ہے اس میں ہمارا کوئی حصہ نہیں؟۔

’’ان ہی دھندلکوں میں بھٹکتے بھٹکتے اچانک مجھے ایک قدیم بلوچ داستان کا خیال آیا۔

بلوچ قبائل میں جو طویل جنگ چھڑی تھی، اس کا باعث یہ بتایا گیا ہے کہ ایک خاتون گوہر ایک قبیلے کی پناہ میں آ گئی تھی۔ مخالف قبیلے کے جنگجوؤں نے پناہ کی بے حرمتی کرتے ہوئے اس کی سیکڑوں اونٹنیوں کو چرا لیا تھا اور برسوں پر محیط قبائلی جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس داستان پر سوچتے سوچتے میں نے ٹیلی فون پر کوئٹہ میں رہنے والے اپنے پیارے دوست اور چھوٹے بھائی شاہ محمد مری کا نمبر ملایا اور اس سے پوچھا؛ ''شاہ محمد، گوہر کی اونٹنیاں تھیں؟''

''سیکڑوں''۔ اس نے اپنے مخصوص اختصار سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر یہ سچ ہے،'' میں نے کہا، ''تو پھر اس زمانے میں بلوچ معاشرے میں عورتوں کا حق ملکیت بھی تھا؟''۔

شاہ محمد مری ہنسا اور سوچ میں پڑ گیا۔ پھر تین سیکنڈ میں اس نے جواب دیا ''یقیناً تھا''۔

''بس تو پھر یہ تصویر اتنی تاریک نہیں''۔

''..........آپ ان ماؤں کے فرزند اور بیٹیاں ہیں جنھوں نے لازوال گیت تخلیق کیے۔ وہ آپ کی بہنیں ہیں جنھوں نے نامساعد حالات میں قلم کی آبیاری کی اور یہ آپ کی بیٹیاں ہیں جو آج درس گاہوں میں علم و حکمت کے چراغ جلا رہی ہیں اور جرأت و ہمت سے زندگی کی تفہیم کر رہی ہیں۔

''ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہم آج کے معاشرے کے ناسوروں پر پردہ ڈالیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر معاشرے کی طرح بلوچستان کے معاشرے میں خیر و شر کی، روشنی اور تاریکی کی، اور انصاف اور ظلم و ستم کی قوتیں ہمیشہ برسرِپیکار رہی ہیں۔ تاریخی وجوہات کی بنا پر روشنی کبھی اندھیرے میں ملفوف بھی ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہ سکتا ہے۔ لیکن اجالا اسی تاریکی کے بطن سے ہمیشہ پھوٹ نکلتا ہے۔ یہ درست ہے کہ علم و ادب بلوچستان کی سرزمین پر بے رخی کا شکار رہا ہے جس خطے میں ایک وقت میں اخبار پڑھنے پر کوڑوں کی سزائیں سنائی جاتی رہی ہوں وہاں علم و ادب کیونکر عام ہو سکتا تھا۔ اور ایسے ماحول میں جبکہ مردوں میں بھی خواندگی کی شرح گرتی چلی جائے وہاں عورتوں کے ادب کی کاوش کی پذیرائی کیونکر ہو سکتی تھی۔ یہ انسانی کاوش کی عظیم الشان جیت ہے کہ

ایسے نامساعد اور حوصلہ شکن حالات کے باوجود اس سرزمین پر خواتین قلم کاروں نے اپنا تشخص کروالیا ہے..........''۔

اسی سیمینار میں ایک پورا سیشن رابعہ خضداری کے لیے مختص تھا۔ ایک مقالہ فہمیدہ کا بھی تھا۔ دیکھیے کہ وہ بلوچستان کی دانش ور اور عظیم شاعرہ اور محبت والی رابعہ خضداری پہ کس خوبصورتی سے تحسین کے گل نچھاور کرتی ہے:

''ذرا غور کیجیے کہ وہ فارسی ادب جس نے عالمی ادب کے شاہکاروں کو پیدا کیا جس میں رومی، حافظ، سعدی، عطاّر، فردوسی اور نظیری پر مغرب کی درس گاہوں میں تحقیق کا سلسلہ برابر جاری ہے اور جس کا شمار دنیا کے عظیم ترین ادب میں ہوتا ہے۔ اس بنیادی پتھر رکھنے والوں میں ایک ایسی خاتون بھی ایستادہ ہے جو ہمارے اپنے خضدار میں موجود تھی اور یہ عظیم کارنامہ اس نے بلوچستان کی سرزمین پر سرانجام دیا۔ رابعہ خضداری کی از سرِنو دریافت صرف بلوچستان کے لیے نہیں، عالمی تحریک نسواں کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ اس کے اشعار میں پانی آذر، سے نقش بنانا سیکھتا ہے اور ہوا مانی سے رنگوں کا جادو سیکھتی ہے''۔

فہمیدہ نے اپنا مقالہ اس بہت خوبصورت پیراگراف پر ختم کیا تھا:

''سو ہماری جانب سے اور سنگلاخ پہاڑی سلسلوں، کلکلاتے جھرنوں، مہکتے گلابوں اور انگور کی بیلوں اور رسیلے پھلوں کے اس مسکن کے باسیوں اور ان کے نرم و نازک اور مضبوط و قد آور خواتین قلم کاروں کو محبت بھرا سلام! اور یہ پیغام......آپ دور کی مسافر ہیں، یہ سفر کی پہلی منزل ہے۔ ابھی تو آپ کو بُکر اور نوبیل ادبی انعامات حاصل کرنے ہیں۔ اگر کیرالا کی ارون دھتی رائے یہ اعزاز حاصل کر سکتی ہے اور کملا داس کو نوبل انعام کے لیے نامزد کیا جا سکتا ہے تو بلوچستان کے لیے بھی ایسا ہونا ناممکن نہیں۔ وہ دن ضرور آئے گا اور اسے لانے والی آپ خود ہوں گی''۔

فہمیدہ کا نظریہ

جولوگ آئیڈیالوجی کے بہت خلاف ہیں، ان کو بھی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر یہ سوچنا ہوگا کہ آئیڈیالوجی انسانی عمل کو ایک سمت دیتی ہے۔ ایک ایسی سمت جس کی بنیاد کسی مذہب، فرقے، نسل یا جینڈر پہ مبنی امتیاز پر نہ ہو۔ اس لیے کہ اس طرح انتشار، بدنظمی، لوٹ مار، خون خرابہ ہی رہے گا۔

بیسویں صدی کے عظیم لکھاریوں پابلونرودا، ناظم حکمت، فیض، جالب، گل خان اور گبرئیل گارشیا مارکوئیز خود کو مارکسسٹ کہتے تھے۔ پبلو پکاسو جیسا آرٹسٹ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا۔ مگر ٹالسٹائی اور دوستوئفسکی اور مست ولطیف نیم مذہبی رہے.......... یہ دونوں گروہ نظریات پر مبنی تھے ناں!!۔

لہٰذا یہ سوچنا تو لازمی ہو جاتا ہے کہ ہماری اِس بڑی دانش ور اور شاعرہ کا زندگی اور اس کے بارے میں نظریہ کیا ہے؟۔ یہ صحیح ہے کہ شاعرلوگ اس بارے میں چمنستان کے اندر لمبی رسی سے بندھے ہوتے ہیں۔ انہیں کس کر فریم میں فٹ کر کے رکھنا فرقہ پرستی ہوگی۔ فہمیدہ کے سلسلے میں بھی

نظریہ کے درزیوں نے بہت کوشش کی کہ اسے کسی بنے بنائے سانچے میں فٹ کر دیں۔ مگر فہمیدہ بالشتیوں کے متعین کردہ ڈھانچوں سانچوں میں فٹ ہو جانے والی روح نہیں ہے۔ وہ تو بس زندگی کو دکاں کے نام کرانے کی ہر کوشش کا مذاق اڑاتی ہے۔ وہ ایک روایت کی وارث ہے، گل خان وایاز، اجمل، اور فیض و جالب کی روایت۔ وہ ادب کو زندگی کا حصہ سمجھتی ہے۔ زندہ چیز، زندہ جاندار۔ وہ زنداں کے داروغہ کو عریاں ہی قرار دیتی ہے، خواہ وہ جمہوریت کے نام پر ہو یا آمریت کے۔ وہ بس، وہ ہے۔ میرا خیال ہے اُسے مارکسسٹ لکھنا ہی محفوظ بات ہوگی۔ (کمیونسٹ لفظ کے ساتھ تنظیمی ڈسپلن جو آ جاتا ہے)۔ مارکسسٹ اس لیے کہ ایک تو وہ مارکس اور اینگلز کی لکھی ہوئی چھوٹی سی کتاب ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' سے بہت متاثر ہے۔ اس نے خود ہی تو لکھا تھا: ''سب سے پہلے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں نے کالج کے پہلے یا دوسرے سال میں پڑھا تھا۔ یہ ایک رات گرلز کالج کے ہاسٹل میں، دو تین لڑکیوں کے ساتھ پڑھا گیا''۔ اب دیکھیے وہ یہ فقرہ کس محبت و چاہت سے لکھتی ہے: ''......ناچیز پر اِن جادو بھرے جملوں کا ایسا اثر ہوا کہ الف سے بے تک پڑھ ڈالا اور تب سے ہر پانچ سات برس بعد پھر پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں''۔

اُس کی ایک اور تحریر کا ایک ٹکڑا بھی دیکھ لیجیے:

''..........سی پی ایم (کمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ) کے دفتر گئی......لیکن یہ نیا دفتر ہے۔ وہ نہیں، جہاں پہلے جایا کرتی تھی۔ نمودرِی پد بھی نہیں ہیں۔ پہلے وہ کبھی کبھار آیا کرتے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کھڑے ہو کر نمستے کرتے تھے۔ اس دفتر میں سب لوگ، کیا چھوٹا کیا بڑا، مل کر کھانا پکاتے تھے۔ پھر اپنے جھوٹے برتن خود دھوتے تھے۔ بس اسی لیے کھچی چلی جاتی تھی۔.......... بالکل خلافتِ راشدہ کا سا منظر ہوتا ہے۔ دل میں سوچتی لیکن کسی کو بتاتی نہیں تھی۔ بتاتی تو کیا ہوتا؟..........لوگ ہنستے کہ سنی سنائی مذہبی کہانیوں پر یقین کرتی ہے اور خود کو مارکسسٹ کہتی ہے ....ایک نظم یاد آئی:

گمراہی اور مصلحتوں کا جب غبار چھٹ جائے گا
تب وہ دن بھی آئے گا

اپنا سرخ کبوتر چوکھٹ چوکھٹ پر پھڑ کائے گا''۔

(اب کی بار۔ دنیازاد نمبر 21 صفحہ 132)

نہ صرف یہ کہ خود مارکسسٹ ہے بلکہ وہ تو اگلے جہان تشریف لے جانے کے بعد بھی مارکسزم کے جاری رہنے کا انتظام کرتی ہے:

''اچھا!'' میں نے اس سے عرض کی، ''اب تک چار مارکسسٹ لڑکیوں کی فہرست بنائی تھی جن کے سپرد انقلاب لانے کا کام کر کے جائیں گے۔ ایک پشاور میں رہتی ہے، ایک حیدر آباد سندھ میں اور دو اسلام آباد میں ہیں، فی الحال.......... اب پانچویں تم ہوئیں۔''

(اب کی بار۔ دنیازاد نمبر 21 صفحہ 133)

عالمی منظر نامے سے متعلق اس کے خیالات بھی کسی مارکسسٹ ہی کے ہیں:

''گلوبلائزیشن کے اس دور میں یہ طے کیا گیا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ سو برس تک صرف کھاتے پیتے طبقے کی سہولتوں کے لیے کام کیا جائے گا۔ سسٹم اُن کے لیے کام کرے گا.......... لیکن غریب غربا نے ہتھیار بند ہونے کو ترجیح دی ہے۔ بالائی طبقے کا معیارِ زندگی جس دیوانگی سے بڑھ رہا ہے، اس سے تو زمین پر کوئی جنگل ہی باقی نہ بچے۔

''.......... ٹیلی وژن پر ایک لڑکی رو رہی تھی؛ ''اس رات وہ...... وہ آئے تھے، بابا کو لے گئے...... اور پھر...... اور پھر...... وہ مبہوت بنی دیکھ رہی تھی...... وہ یہ سب جانتی تھی مگر اتنی نزدیک سے یہ سب کچھ دیکھنا اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس رات وہ انہیں محمد پور کے خونی ٹھکانوں میں لے گئے تھے۔ پہلے شاندار اذیت پہنچائی ہو گی۔ دوسرے دن ہماری فوج ہتھیار ڈالنے والی تھی...... رات کی دہلیز پر خون کی پیاس بھڑک رہی تھی...... ان ادیبوں، شاعروں، دانش وروں کی چیخیں دوسروں نے سنی بھی نہ ہوں گی، یا شاید سنی ہوں اور اپنے گھروں میں بیٹھے کانپتے رہے ہوں...... گھٹنوں میں منہ دیئے''۔ فہمیدہ ریاض اٹھ کر باتھ روم گئی، دروازہ بند کیا اور سنک پر قے کرنے لگی۔

یہ ڈھاکہ میں اُن کا پہلا دن تھا...... پہلی رات..........''

(ناول ''زندہ بہار'')

اُس کے نظریات کا ایک اور رُخ دیکھیے:

''کیا میں اسامہ بن لادن سے نفرت کرتی ہوں؟ نہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ ہم سے بہت دور ہے۔ افغانستان پر امریکہ کے حملے کے وقت ہم شدید کرب میں مبتلا تھے۔ لیکن اس کے نتائج کیا ہمارے لیے برے نکلے؟ نہیں۔ برسوں بعد رمضان کا مہینہ سکون سے گزرا اور ایک مسرور عید.......... ورنہ مجاہدین اسلام خوفناک آوازوں میں چیخ وپکار کرتے ہوئے جینا دوبھر کرتے رہتے تھے۔ کیا میں صدام حسین کو پسند کرتی ہوں؟ نہیں۔ نہایت خبیث اور مکروہ لگتا ہے۔ پھر عراق پر امریکہ کے حملے سے دل کیوں بیٹھ جاتا ہے؟ معلوم نہیں.......... اس کے بعد امریکہ، ایران پر حملہ کرنا چاہے گا۔ یہی اس کے تیور نظر آ رہے ہیں۔ تو کیا ایران میں کوئی منصفانہ حکومت ہے؟ نہیں .... وہاں تو لبرل انتخابات میں جیت گئے تھے اور قدامت پرستوں نے اقتدار ان تک منتقل بھی نہیں کیا۔ غیر قانونی، ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور عدالتوں کے دقیانوسی جج اپنے ملک کے بہترین فرزندوں کو سزائیں سناتے رہتے ہیں۔ تو پھر وہاں بھی رجیم چینج کیوں نہ ہو؟ رجیم چینج امریکہ کرائے گا؟ عراق ہو یا ایران .... یہ سب کچھ کس قیمت پر ہو گا؟ اپنے پٹھو، اپنے چمچے بٹھائے گا.......... اور کیا کرے گا؟ وہ ان قوموں کو ذلیل کرے گا۔ امریکی اسٹیبلشمنٹ عاقلوں اور دانش وروں پر مشتمل نہیں ہے، جن سے آیت الاؤں اور مذہبی جنونیوں سے بہتر کسی عمل کی توقع کی جائے۔ یہ انتہائی گھٹیا، سفلی خواہشات سامنے لاتے رہتے ہیں......''۔ (1)

میں شاید بار بار اس طرف اشارہ کرتا رہا ہوں کہ فہمیدہ بوسیدگی کی دانش ور نہیں ہے، وہ کبھی بھی ماضی کی زنجیر سے چپکی نہیں رہتی۔ ہمیشہ وقت کے ساتھ ساتھ، عصر کے سنگ سنگ رہتی ہے۔ حاضر کی دانش ور ہے وہ۔ وہ تازہ بہ تازہ کی دانش ور ہے۔ فہمیدہ ہم عصر ادب میں شاید سب سے اصل اور خوبصورت آواز ہے:

''.......... ایک منصوبہ خلافت بنانے کا چل رہا ہے جس میں قومی ریاستیں ختم ہو جائیں۔ اُس میں بس سلفی ہوں، سب فرقوں کو ذمی بنا دیں، جزیہ لیں۔

''جو لوگ القاعدہ اور اُس کی سوچ کی حمایت کرتے ہیں، اُن کو اندازہ نہیں کہ یہ راستہ

پاکستان کو کبھی ایک نارمل ملک نہیں بننے دے گا۔ یہ ایک جنگی چوکی کی شکل اختیار کر لے گا، ایک لاوارث سرزمین جہاں سے دنیا کے ہر ملک پر حملہ کیا جا سکے گا اور اس کا مقسوم تیزی سے کرائے کے فوجیوں کی بیرک میں تبدیل ہونا ہی ہے جو دنیا کے طالع آزما اپنے لیے استعمال کر سکیں گے۔ ہمارے جوہری ہتھیار ان کے ہاتھوں میں آ جانا ہرگز ناممکن نہیں............لیکن اس وقت ہماری افواج بوجوہ، ایک نقاب کے پیچھے سے کام کر رہی ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو اِن طالبان اور اُن کے صومالی سوڈانی، عرب، برمی، فلپینی اور نہ جانے کہاں کہاں کے جہادیوں کا پردہ فاش کر کے عوام کو اپنے ساتھ لے سکتی ہیں۔ مگر وہ ایسا کیوں نہیں کر رہی ہیں؟۔ کیا وہ مستقبل میں ان سے کچھ کام لینا چاہتی ہیں؟''۔

مجھے یاد ہے کہ جب عقل و خرد اور مہر و محبت کے داعی، رحمٰن بابا کے مزار کو بموں سے اڑا دیا گیا تھا تو فہمیدہ نے احتجاجی ردِعمل فوری طور پر دکھا دیا تھا:

آنسوؤں کے سوا اپنے بس میں کیا ہے
سوتری نذر ہے جھلملاتی لڑی
اشک محراب و گنبد کے خم کے لیے
زائروں کی دعا کے بھرم کے لیے
آج اٹھنے لگا ہے جہاں سے دھواں
کل یہیں عود و عنبر کی مہکار تھی
فاختہ اور کبوتر کی ہنکار تھی

اشک ان کے لیے بھی جو معذور ہیں
جن کو حسنِ تخلیل سہاتا نہیں
نغمۂ سرمدی، ساز اور راگ کا
جن کے بے حس دماغوں کو بھاتا نہیں
قمریوں کی چہک، بلبلوں کی ندا

رقصِ طاؤس کا، کچھ بتاتا نہیں
ان پہ کیسا سحر زندگی نے کیا
جن کی حالت ہے ایک وقت کا شعبدہ
صرف بارود کی آج بو ہے یہاں

ایک سرمست صوفی سدا نغمہ ریز
لالہ و یاسمن، نرگس و نسترن
سرخ مہکے گلاب، دیواروں کے بن
اور ان سے گزرتی ہوا عطر بیز
تھا بسیرا ترا اِن کے ہی درمیاں

ہے ابھی ان پہاڑوں میں مرمر کی رگ
قلب انساں کو پیارے ہیں سنگِ مزار
خلق تعمیر کر لے گی پھر یادگار

............اور پھر، زرداری کی بادشاہی آئی۔ بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور فہمیدہ نے اسلام آباد میں بھاگ دوڑ کر کر کے پیپلز پارٹی کو رجھا ہی لیا اور بالآخر روزگار لے ہی لیا۔ وہ اردو ڈکشنری بورڈ کی سربراہ مقرر ہوئی۔ کچھ عرصہ تو چلی مگر تنگ دستی اور فہمیدہ کی یاری لگتا ہے جنموں پرانی ہے۔ اب وہ پھر بے روزگار ہے۔ 66 سال کی جو ہوگئی۔ (پیدائش 28 جولائی 1945 بمقام میرٹھ۔ میرٹھ اس لیے کہ حسنہ بیگم کے والدین وہیں تھے۔ وہ زچگی کے لیے حیدرآباد سے اپنے والدین کے پاس میرٹھ چلی گئی۔ اور جب فہمیدہ چالیس روز کی ہوگئی تو 'چِلہ' منا کر واپس حیدرآباد لائی گئی)۔ اب کے سپریم کورٹ نے آنکھیں بند کر کے ''یہ منجور، یہ نامنجور'' کہہ کر سارے 66 سالہ ادیبوں دانش وروں کو سرکار، نیم سرکار سے نکلوا دیا۔ فہمیدہ اردو لغت بورڈ کی ایڈیٹری سے برطرف۔

دل اور دنیا کو تسلی دینے کے لیے اُس کے پاس ایک دفتر (ٹھکانہ) تھا، ڈکٹیشن کو ایک ٹائپسٹ تھا، بڑھاپے کی لاٹھی کے بطور ایک چپڑاسی تھا، سواری کے لیے رکشوں ٹیکسیوں کے بجائے ایک کھٹارا کار موٹر تھی، تنخواہ کے چار پیسے تھے، اور بوڑھے گھر کی بوڑھی دیواروں کی بوڑھی تنہائی سے چار چھ گھنٹے کی نجات تھی..........مگر یہ سب باتیں بوڑھی تقدیر کو حسد سے خاکستر کیے دیتی تھیں۔ لہٰذا وہ برطرف۔ اب پھر وہی بے سروسامان، وہی یک وتنہا فہمیدہ..........اُس کے شہر پہ مسلط فسطائیت کے وجوہات کی سمجھ آتی ہیں!۔

اچھے امرود اور جامن کھانے کبھی کبھی وہ ایک دو دن کے لیے (ایک زمانے میں اپنے ٹریڈ یونین ازم کے لیے موزوں ترین، اور اب ٹریڈ یونین کے قبرستان شہر، یعنی) کراچی سے نکل پڑتی ہے اور اپنی بہن نجمہ کے پاس حیدرآباد جاتی ہے، جو ایک معزز سندھی گھرانے کی معزز فرد ہے۔ فہمیدہ کی ایک اور بہن فرخندہ تھی جس کی شادی والد نے شہداد پور کے غلام حسین پریانڑیں سے کی تھی۔ فہمیدہ، ماں باپ کی دوسری اولاد ہے۔ وہ بڑی بہن سے نو سال بعد پیدا ہوئی۔ درمیان میں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ تماشا دیکھیے کہ پیروں فقیروں، تعویزوں گنڈوں سے انکاری فہمیدہ کی اپنی پیدائش والدین کی طرف سے پیر فقیر، گنڈہ تعویز، دم چھو اور نذر نیاز کر کر کے ہوئی تھی۔ کتنی متبرک آمد ثابت ہوئی یہ، متبرک قیام، متبرک کام۔

تھائی رائیڈ کی مریضہ، سرتاپا شوگر میں ملفوف، بلڈ پریشر کے کوڑے کھاتی فہمیدہ اب بھی ظلم وستم کے خاوندوں کو ٹھینگا دکھاتی اپنے لڑکپن کے مؤقف پر ڈٹی ہوئی ہے۔ وہ بستی کو بازار نہ بننے دینا چاہتی ہے۔ وہ آہو کو رم کرنے دینا چاہتی ہے۔ وہ بچے بالک کو ہنس لینے دلانا چاہتی ہے۔ وہ گلیوں کو بس لینے دینا چاہتی ہے۔ وہ اب بھی تازہ ترین خیالات تخلیق کرتی ہے، وہ اب بھی پوری شام آپ کو ہنساتی ہے۔ یہ پُر امید انسان کہیں بھی مایوسی کے وائرس کو قریب پھٹکنے نہیں دیتی..........نہ اپنے، نہ آپ کے۔

ایک عشرے سے نیو ورلڈ آرڈر والی ''برباد کردینے والی'' جنگ نے بلوچستان میں اپنے

پاؤں جمار کھے ہیں، دوہزار یازدہ، دوازدہ، سیزدہ اور چہاردہ کے سالوں میں اس جنگ نے شیعہ کشی کی نئی اور ہیبت ناک صورت اختیار کی۔ کراچی اور کوئٹہ میں شیعہ ماری گویا روز کا معمول بن گئی۔ ہم سب اس منحوس فضا میں بے امید، احساس کی عمیق سطحوں پر تھے۔ مگر فہمیدہ کا تو سمجھو سر گھوم گیا۔ سامنے گلیوں میں فرقہ ونسل وزبان کی بنیاد پر انسان مارے جائیں، انہیں کافر قرار دے کر سماج سے نکال باہر کیا جائے تو کہاں خاموش رہا جاسکتا ہے۔ ایسے بنیادی انسانی معاملات پر آج چپ رہا جائے تو اس کا حساب کل نہیں آج ہی دینا ہوتا ہے۔ ایک دانش ور وادیب کا سب سے بڑا فرض تو ایسے مواقع پہ کود جانا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کود گئی۔ ہم سب سے پہلے۔ فیس بک، ای میل، فون کالیں..........مگر اُسے بھرے شہر کراچی میں کوئی ساتھی نہیں ملا، لے دے کے اسے ''ایم کیو ایم'' میں دو چار ساتھی ملے۔ ایک علما کانفرنس بلوائی گئی، ایک جلوس سی چیز نکل گئی۔

اسی طرح شیعہ نسل کشی کے خلاف، اور طالبان کی بنیاد پرستی کے خلاف غیر شیعہ دانش وروں میں فہمیدہ کی احتجاجی آواز سب سے بلند اور بروقت رہی۔

انہی دنوں وہ پھر کوئٹہ آئی۔ سنگت اکیڈمی نے اپنے پچاس دانش وروں کے اکٹھ سے اُس کی میزبانی کی۔ فہمیدہ وہاں بھی اسی ایجنڈے کے ساتھ بولی۔ مگر یہاں بلوچستان میں شیعہ کُشی کے علاوہ بھی قیامت کے اظہار کے دسیوں نمونے موجود تھے۔ ٹارگٹ کلنگ، مسخ شدہ لاشیں، سیاسی کارکنوں کا ریاستی اغوا، اغوا برائے تاوان......شیعہ کشی تو اُن میں سے محض ایک تھی، سب میں سے حالیہ ترین تھی۔ وہ یہاں عام لوگوں سے ملی، چائے والے بچے سے، اسسٹنٹ پروفیسر سے، گائناکالوجسٹ سے، ایڈیشنل سیکرٹری سے، پنڈال پر خیمہ گاڑنے والے بوڑھے بلوچ سے۔ شہر کو دیکھا، جیسے ایک مقبوضہ شہر ہو۔ وردی والے ہر ایک کی تفصیلی تلاشی لیتے رہتے تھے۔ فہمیدہ کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس کے ایجنڈے میں توسیع کی سخت ضرورت ہے۔ اتنا کچھ جو سننا پڑا اُسے۔ کراچی واپس ہوئی تو نئے سرے سے غور کیا اور توسیعی ایجنڈے پر کام شروع کردیا۔

اب وہ وکی پیڈیا سے بلوچستان کا باب کاپی کر کے فیس بک پر لگاتی ہے۔ بلوچ دانش وروں سے بحث مباحثہ نقل کرتی ہے۔ بلوچوں پر کی گئی اپنی گذشتہ والی شاعری دوبارہ چھاپ رہی

ہے۔ایک نئی بحث کا آغاز۔

فہمیدہ شاید پاکستان کی واحد دانش ور اور شاعرہ ہے جس نے کراچی میں بیٹھ کر ایم کیو ایم سے ''قتل کی سیاست'' روک دینے مطالبہ کیا۔اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنا کوئی فہمیدہ ریاض سے سیکھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب کوئٹہ میں ہزارہ برادری کا قتلِ عام کیا جا رہا تھا تو اردو دانش وروں نے (جن میں اکثریت شیعہ مسلک سے تعلق رکھتی ہے) فیس بک،ٹوئٹر اور وائبر وغیرہ پر بہت ہی عام،اور کبھی کبھی مسلکی چشمے پہن کر اس پر اپنے ردِعمل کا اظہار کیا تھا۔ میں نے سنجیدہ بحث چھیڑنی چاہی تو فہمیدہ وہ واحد دانش ور تھی جس نے جواب دیا تھا:

''شاہ محمد، میں سب کے سامنے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں، اگر تم پارٹی بناؤ تو میں شامل ہو جاؤں گی۔ بناؤ گے پارٹی ؟ ۔مڈل کلاس روزگار کی چکی چلائے کہ پارٹی بنائے ؟ ۔اوپر سے یہاں صوبوں کے حقوق کا مسئلہ اٹکا پڑا ہے۔اس لیے آل پاکستان سطح کی جماعت بن نہیں پاتی ۔آئی ایس آئی ہی پارٹی بناتی رہتی ہے۔ جو ہمارے معروضی حالات ہیں،ان میں موجودہ پارٹیز کے ساتھ ہی کام کیا جا سکتا ہے۔مگر ان کو سیدھا راستہ دکھاتے رہنا چاہیے''۔

(میں خاموش رہا۔اُسے کون سمجھائے کہ پارٹی ہوا میں نہیں بنتی ۔افراد سے بنتی ہے، افراد سے۔ایک فرد میں،ایک فہمیدہ..........مگر اُسے شاید بڑے افراد اور بہت افراد چاہئیں !!)۔

17 مئی 2013 کو جب حکومت پاکستان نے 51 ہندوستانی ماہی گیروں کی رہائی کا فیصلہ کیا تو پورے ملک میں فہمیدہ وہ واحد دانش ور تھی جس نے کہا،''مرحبا! آج کتنے مچھیروں کے گھر میں چراغاں ہوگا۔اس سیاست اور نام نہاد قومی غیرت میں الجھی ہوئی ہیں کتنی انسانی زندگیاں جشن منائیں گی !۔شاہ لطیف نے کہا تھا: 'گھٹو/ گھاٹو گھر نہیں آیا' ....آج گھاٹو گھر لوٹے گا''۔

2013 کے اواخر میں جب بنگلہ دیش میں ایک غدار کو پھانسی دی گئی تو پاکستان کے دائیں بازو نے یہاں واویلا کھڑا کر دیا۔جلوس وغیرہ تو اپنی جگہ نواز و عمران نے قومی سمبلی میں اُس کے خلاف قرارداد تک منظور کر دی۔نصف صدی گزرنے کے بعد بھی پاکستان کا حاکم بنگلہ دیش کے

اندرونی معاملات میں مداخلت ختم نہیں کرتا۔فہمیدہ کا، یک فقرہی تبصرہ یوں ہے:

''یا حماقت تیرا ہی آسرا ہے.......... ایسا جدید دنیا میں کبھی کہیں ہوا ہے جس طرح ہم کر رہے ہیں؟ یا مظہر العجائب!''۔

ہماری یہ دانش ور صورت حال کا عجب گہرائی میں تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے:

''یہاں ایک عجیب سی ریس لگی ہوئی ہے کہ کون زیادہ بڑا محبّ وطن ہے..........آپ اکھاڑہ تصور کر لیں جس میں پہلوان پٹھے دکھا دکھا کر اپنی حب الوطنی میں بڑائی ثابت کر رہے ہیں (عشقِ رسول کے بعد یہ دوسرے نمبر پر آتا ہے جس میں سینے پہ ہاتھ مار کر دعویٰ یہ ہے کہ سب سے بڑا عاشق میں......تو دوسرے کہے،نہیں میں......تو پہلا کہے کہ تمہاری تو ایسی کی تیسی) جس کے بعد دونوں سڑک پر اکڑ کر چل سکتے ہیں اور باقی کے غریب شہری تھر تھرائیں۔

''......ارے بھائی...... ہر نارمل آدمی اپنے وطن سے پیار کرتا ہے......آدمی کیا جانور تک ......پیڑ پودے بھی کرتے ہیں......دوسری زمینوں پر نہیں پھلتے ،یا مشکل سے لگ پاتے ہیں''۔

ابھی چند روز پہلے وہ کسی کو بتا رہی تھی کہ،''..........اس بات سے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، پنڈتوں پادریوں کے طبقے کی بہت دل آزاری ہوئی تھی۔اُن کی تو روزی روٹی کا سوال تھا..........''۔

ایک اور عجیب واقعہ بھی سن لیں۔2014 کے شروع میں سعودی شہزادہ فہد بن سلطان عبدالعزیز ہوبارا بسٹرڈ (تلور) کا شکار کرنے پہنچا۔مرکز اور صوبے کے وزیروں گزیروں نے استقبال کیا۔فہمیدہ کا ردِعمل یوں تھا:

''عرب میں یہ بات مشہور ہے کہ اس پرندے کو کھانے سے مردانہ قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔اسی لیے عرب امرا اس کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ یہ پنچھی مدت سے ایک نایاب پرندہ بتایا جا رہا ہے۔اس کی نسل کو بالکل ہی ختم ہونے کا خطرہ ہے۔عربوں میں اتنی دانش مندی ہونی چاہیے کہ وہ اِن فضول شوقوں کے باعث ہمارے پہلے سے ناراض صوبے کے زخموں پر نمک نہ چھڑکیں۔ مردانہ قوت میں اضافے کے لیے اپنی عورتوں سے بہتر سلوک کریں اور اُن کو کار چلانے پر گرفتار کرنا

بند کریں۔ جہالت کے پیکر اور نمونے جو کہ یہ بن چکے ہیں، دنیا بھر کے مسلمانوں کے منہ پر سیاہی پوتنا بند کر دیں‘‘۔

الختصر، فہمیدہ ریاض کا پسندیدہ نظام کوئی بے سروپا دعووں والا سماج نہ ہوگا۔ دودھ و شہد و شراب کی نہریں وہاں نہیں بہتیں۔ وہاں ہم فرشتے نہیں بن جائیں گے بلکہ ہم تو سیدھے اور پیچیدہ انسان، انسانوں کی طرح لڑیں گے جھگڑیں گے، روٹھیں گے، منائیں گے۔ مکمل طور پر انسانوں کا سماج، جہاں بس شیطان نہ ہوگا، جہاں بس درندہ نہ ہوگا......

23 جنوری 2014، شام کو اُس کا فون آیا۔

’’تم .... کو جانتے ہو؟‘‘

’’جی ہاں وہ سرکاری آدمی ہے‘‘۔

’’جو بھی ہے، وہ لوگ سرینا ہوٹل میں گل خان نصیر کا دن منا رہے ہیں۔ میں آؤں گی۔ اُسے کہہ دینا میرا جہاز کا ٹکٹ فلاں پتے پر بھیج دے‘‘۔

’’نہیں فہمیدہ، مجھ سے کچھ ’پیغام رسانیاں‘ بالکل نہیں ہوتیں۔ میں اُس کا فون نمبر تمہیں ایس ایم ایس کرتا ہوں، خود ہی کہہ دینا‘‘۔

’’مجھے ایس ایم ایس کرنا مشکل ہوگا‘‘۔

’’اچھا میں اُسے فون کر کے کہتا ہوں، وہ تمہیں خود فون کرے گا‘‘۔

میں نے اُس شخص کو فون کیا، اور کہا کہ فہمیدہ کہتی ہے اسے فون کر لو۔ اُس نے نہ صرف ’’جی ہاں‘‘ کہا بلکہ یہ بھی کہ ’’میں آپ کا دعوت نامہ لے کر کل خود آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا‘‘۔ وہی خجالت، وہی مدافعتی لہجہ......

میں اُس زمانے میں فہمیدہ پر یہ کتابچہ لکھ رہا تھا۔ اُس کی شاعری سے بہت متاثر، میں اُس کی بہت تعریف کرنا چاہتا تھا، مگر یہاں دو چار دوستوں سے ملنے، جہاز، ہوٹل کی دو روزہ سرکار اس قدر عزیز کہ دلیل سننے کو تیار نہیں۔ دل ٹوٹ سا گیا۔ سارے دوستوں کو فون کر کر کے اس کی خوب برائی کی، اپنے ٹمپو کے ٹوٹنے کا تذکرہ کیا۔ اور ہم سب مل کر فہمیدہ کی اِس دنیاوی کمزوری کو برا کہنے لگے۔

مگر، اگلی شام کو فاطمہ حسن کا فون تھا؛

’’یہ جو ہماری تمہاری دوست ہے ناں فہمیدہ، یہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر ڈالتی ہے۔ اب وہ کوئٹہ نہیں جا رہی۔ کہتی ہے ہزارہ قبائل کی لاشیں پڑی ہیں روڈ پر، اور میں سیرینا ہوٹل ....نہیں میں نہیں جا رہی۔ پھر شاہ محمد والے بھی اُس میں شرکت نہیں کر رہے، ضرور اچھے لوگ نہیں ہوں گے ....‘‘۔

اور پھر اُس کا فیس بک جواز یوں تھا۔

’’کوئٹہ نہیں‘‘

’’کل جانا تھا۔ بلوچستان کی صوبائی حکومت گل خان نصیر یادگاری مشاعرہ کر رہی ہے۔ لیکن لوگ اپنے پیاروں کی میتیں لیے شاہراہ پر بیٹھے ہیں اور ہم سرینا ہوٹل میں؟ نہیں۔ اس سے تو بہت بہتر، یہیں کہیں اس کراچی کی کسی سڑک پر دھرنے میں بیٹھنا ہوگا۔ یہیں آسمان نیلا ہے ان کے آنسوؤں سے، یہیں ہوا ٹھنڈی اُن کی آہوں سے۔ اپنا مقام تو دوستو یہاں ہے۔ سرینا ہوٹل دوسری مخلوقات کے لیے ہے۔ سو اُن کو مبارک ہو۔

’’پیارے دوستو۔ آپ اِن دھرنوں میں شرکت کیجیے۔ اپنے اہلِ تشیع بھائیوں اور بہنوں کو اس کڑے وقت میں تنہا نہ چھوڑیے۔ ....ہمیں اپنا نام تاریخ کے صفحے پر درج کرانا ہے کہ ہم نے انکار کیا تھا‘‘۔

اُس کا یہ جواز درست، مگر ذرا واقعاتی سا لگا۔ میں نے اس پورے معاملے پر اُس کی اپنی نظم نقل کر کے اُسے بھیج دی۔ اُس کی ’وصیت‘ (تعزیتی قرار دادیں) کو نقل کر کے اُسے بھیجا:

یارو! بس اتنا کرم کرنا
پسِ مرگ نہ مجھ پہ ستم کرنا
مجھے کوئی سند نہ عطا کرنا دین داری کی
مت کہنا جوشِ خطابت میں

دراصل یہ عورت مومن تھی
مت اُٹھنا ثابت کرنے کو ملک وملت سے وفاداری
مت کوشش کرنا اپنالیں حکام کم ازکم نعش مری

یاراں، یاراں
کم ظرفوں کے دشنام تو ہیں اعزاز مرے
منبر تک خواہ وہ آ نہ سکیں
کچھ کم تو نہیں دلبر میرے
دمساز مرے
ہر سر حقیقت جاں میں نہاں
اور خاک وصبا ہم راز مرے
توہین نہ ان کی کر جانا
خوشنودئ محتسباں کے لیے
میت سے نہ معافی منگوانا

تدفین مری گر ہو نہ سکے
مت گھبرانا
جنگل میں لاش کو چھوڑ آنا
یہ خیال ہے کتنا سکوں افزا
جنگل کے درندے آلیں گے
بن جائے نچے مرے خیالوں کو
وہ ہاڑ مرے اور ماس مرا

اور میر العلِ بدخشاں دِل
سب کچھ خوش ہو کر کھالیں گے

وہ سیر شکم
ہونٹوں پہ زبانیں پھیریں گے

اور ان کی بے عصیاں آنکھوں میں چمکے گی
تم شاید جس کو کہہ نہ سکو، وہ سچائی
یہ لاش ہے ایسی عورت کی
جو اپنی کہی کہہ گزری
تا عمر نہ ہرگز پچھتائی

میں نے اسے لکھا کہ ’’جب اپنے لیے یہ کچھ چاہتی ہو تو میرے اور اپنے گل خان کے لیے ایسا کیوں نہیں چاہتیں؟‘‘

بس، وہ تو رُک گئی، اور گل خان کے افکار کی لاش کور کمانڈروں، چیف سیکریٹریوں کے حوالے کرنے کے جرم میں شریک ہونے کوئٹہ نہ آئی۔ مگر میں تو ہل کر رہ گیا کہ بلوچستان میں اس قدر مضبوط وتوانا تحریک رکھنے کے باوجود ہم گل خان کو حکمران طبقات کی حوالگی سے نہ بچا سکے تو بے تحریک وبے تنظیم کراچی کیا کر پائے گا، جب خود فہمیدہ جب مر جائے گی۔ اُس کی تو وصیت کے بالکل برخلاف، اُسے دین داری کی سند بھی عطا کی جائے گی، جوشِ خطابت میں اِس عورت کو مومن بھی قرار دیا جائے گا اور اس کی لاش بھی اُس کے ہم فکروں سے چھین کر، حاکموں کے حوالے کی جائے گی۔..........یہی کچھ آج گل خان کے ساتھ سرینا ہوٹل میں ہو رہا تھا، جس میں شرکت سے فہمیدہ ریاض نے انکار کر دیا۔ مجھے اس کی دوستی پہ فخر ہے۔

****

اب ایک دلچسپ بات:

چند برس قبل جب میں کراچی گیا تو وہ دوستوں کو ایک بہت ہی دلچسپ بات بتا رہی تھی:

ایک بہت بڑے، انگریزی اخبار نے فہمیدہ کے دو تین جاننے والے بڑے دانش وروں سے کہا کہ وہ فہمیدہ ریاض کی Obituary لکھ دیں۔ دانش وروں نے احتجاج کیا: ''کیا کرتے ہو، وہ تو ابھی زندہ ہے اور بھرپور تخلیقی تحریریں لکھ رہی ہے۔ 'سلیمان' عنوان کی شاہکار نظمیں تخلیق کر رہی ہے، 'مزدک' جیسے شاندار ناول لکھ رہی ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کے لیے جلسہ جلوس منعقد کر رہی ہے''۔ پتہ چلا کہ یہ بڑے بڑے اخبار پہلے سے بڑے لوگوں کی Obituary لکھ رکھتے ہیں۔ تاکہ جب اُس کی موت ہو جائے تو ٹھک سے چھاپ دیں۔

سرمایہ داری نظام ہم سب کے مرنے سے پہلے ہماری Obituary آس لکھ چکا ہوتا ہے، ہمیں بیچ چکا ہوتا ہے!!۔

موت برحق ہے۔ مگر یہ ایک قابلِ نفرت حقیقت ہے۔

فہمیدہ کو لمبی عمر نصیب ہو، صحت بھری، مسرت بھری۔

حوالہ جات

1- ریاض، فہمیدہ۔ شیشۂ دل۔...........صفحہ 95

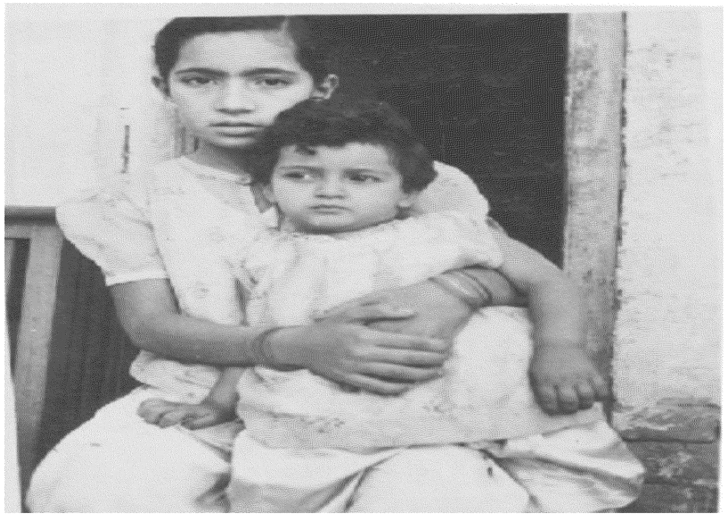

معصوم بچپن............ننھی فہمیدہ اپنی آپا کی گود میں

تین سہیلیاں............تین بہنیں

کوئٹہ اور فہمیدہ......اپنی بہنوں اور بہنوئی کے ہمراہ......ہنہ جھیل کے کنارے

’پتھر کی زباں‘ کی باغی لڑکی، ممتا کا احساس لیے

دانش ور، فہمیدہ ریاض

کتاب کی دیوانی، فہمیدہ ریاض

دو بیدار اذہان......ہم عصر، ہم فکر...... ارون دھتی رائے، فهميده رياض